ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام جمال پور، پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ۔ مثلاً توحید ' ہدایت و ضلالت ' عبادت ' جہاد ' آزادی ' رواداری قومیت اسلامی ' عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا ' رسول کی صحیح حیثیت ' رسالت محمدی کا ثبوت عقلی ' شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق ' منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت مجلد ۳ روپے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/-/۲ علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

بابت ماہ محرم و صفر ۱۳۶۲ھ (فروری ۱۹۴۳ء) جلد ۲۲ - عدد ۱-۲

ضروری اعلان

میں نے ۲۳ رنومبر ۴۲ء کو رسالہ ترجمان القرآن کے انتظام سے سید محمد شاہ صاحب کو الگ کر دیا ہے۔ جن اصحاب کے ذمہ دفتر ترجمان القرآن کا کوئی مطالبہ واجب الادا ہے وہ آیندہ کوئی رقم شاہ صاحب کو نہ دیں۔ نیز اس تاریخ کے بعد میری جس قدر کتابیں شاہ صاحب کے پاس پائی جائیں وہ مال مسروقہ سمجھی جائیں اور جو صاحب ان سے یہ کتابیں خریدیں۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ دراصل چوری کا مال خرید رہے ہیں۔ میں یہ اعلان دلی تکلیف کیساتھ کر رہا ہوں۔ اپنے کسی سابق رفیق سے علیحدگی کے بعد اس قسم کا اعلان کوئی خوشگوار چیز نہیں ہے مگر مجھے افسوس ہے۔ کہ سید محمد شاہ صاحب نے اپنی خیانت اور نہایت بے باکانہ بددیانتی سے مجھ کو اس اعلان پر مجبور کر دیا۔ شاہ صاحب ساڑھے چار سال تک میرے رفیق رہے ہیں۔ اس دوران میں ان کی مسلسل خیانتوں کے باوجود میں صبر و تحمل اور ہمدردی کے ساتھ ان کے اخلاق کی اصلاح کیلئے کوشاں رہا اور ہر ممکن طریقہ سے میں نے کوشش کی کہ جو شخص میرا رفیق کار بن چکا ہے اسکے اخلاق میں اگر کوئی کمزوری ہے تو اسے قربانی اور ہمدردی کیساتھ دور کر دوں۔ لیکن ان پر اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ روز بروز خیانت میں وہ بیباک ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ جب میں نے عاجز آکر ان سے دفتر کا چارج لیا تو ان سے ایسی صریح بددیانتیوں کا ظہور ہوا جو میری توقع سے بہت زیادہ تھیں۔ میں شاید اس پر بھی صبر کر لیتا مگر مجھے معلوم ہوا کہ چارج دینے کے بعد دوسرے ہی دن انہوں نے اس دفتر کی چند کتابیں لاہور کے ایک تاجر کتب کے ہاتھ فروخت کیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کتابوں کا ایک حصہ [illegible] کر رکھ لیا ہے اور اب وہ اسے فروخت کر رہے ہیں۔ شاہ صاحب جانتے ہیں کہ میں اپنے مسلک کی بنا پر پولیس اور عدالت میں نہیں جا سکتا۔ اسی لئے انہوں نے اتنی جسارت دکھائی لیکن انہیں یہ خیال نہ رہا کہ دنیا کی پولیس اور عدالت کے اوپر بھی کوئی پولیس اور عدالت موجود ہے۔ جس کی گرفت سے وہ بچ نہیں سکتے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی - ایڈیٹر ترجمان القرآن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اِشارات

شعبان ۶۱ھ کے پرچہ میں اعلان کیا تھا کہ تین مہینوں (جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ اور رجب) کی اشاعتیں منسوخ کرکے آئندہ سے یہ رسالہ بروقت شائع ہوتا رہے گا لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد کاغذ کا قحط اس حد تک پہنچ گیا کہ رمضان اور شوال کے پرچے تیار ہو کر پریس میں پڑے رہے اور بازار میں ایک رِیم کاغذ بھی دستیاب نہ ہوسکا۔ کاغذ کا جو ذخیرہ پہلے فراہم کیا گیا تھا اس کا بیشتر حصہ جماعت کے لٹریچر کی طباعت میں صرف ہوچکا تھا۔ شعبان کے اختتام پر میرے اندازے کے مطابق رسالہ کی اشاعت کے لیے دو مہینہ سے زیادہ کا ذخیرہ موجود تھا، مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ ایک رفیق کار کی غداری و خیانت سے وہ ذخیرہ خرد برد ہوگیا۔ اس کے بعد مسلسل چار مہینے مجھے اور میرے بعض رفقاء کو کاغذ کی فراہمی کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ آخرکار محرم کے اواخر میں بمشکل اتنا کاغذ فراہم ہوسکا کہ دو پرچے طبع کرائے جاسکتے تھے، اور وہ بھی اس قدر گراں قیمت پر کہ چار پرچوں پر جو لاگت آسکتی تھی اس سے زیادہ دو پرچوں پر صرف ہوگئی۔ مجبوراً انہی دو پرچوں کو چار پرچوں کا قائم مقام کرنا پڑا۔ اس پر مزید افسوس یہ ہے کہ کاغذ ملا بھی تو وہ گلابی رنگ کا تھا جس کو استعمال کرنے سے طبیعت سخت ابا کرتی تھی، لیکن ناچار اس خیال سے اُسی کو استعمال کرنا پڑا کہ اشاعت بند ہوجانے سے کسی نہ کسی طرح اس کا جاری رہنا بہرحال بہتر ہے۔ یہ وہ مصائب ہیں جو شیاطین جن و انس کے برپا کردہ فساد کی بدولت ہم پر نازل ہوئے ہیں۔ دُنیا میں جھوٹ پھیلانے کے لیے اور بندگانِ خدا کو فریب دینے کے لیے کاغذ موجود ہے اور اتنا موجود ہے کہ ہوائی جہازوں سے ریم کے ریم پھینکے جاسکتے ہیں، مگر خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ایک ایک شیٹ کا غذ فراہم ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس کا نام لینے والوں پر یہ بلا کب تک مسلط رہے گی۔

بظاہر مجھے امید نہ تھی کہ اب اس رسالہ کو زندہ رکھا جاسکے گا، بلکہ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ جماعت کے بُک ڈپو

میں کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے اس کے ختم ہو جانے کے بعد لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ لیکن الحمد للہ کہ وسط ماہ صفر میں کاغذ کی فراہمی کا اس حد تک انتظام ہو گیا کہ سال ڈیڑھ سال تک رسالہ اور کتابوں کی اشاعت کا کام مسلسل جاری رہ سکتا ہے۔ اگرچہ یہ کاغذ جو ہمیں ملا ہے، قبل جنگ کی قیمت کے مقابلہ میں چھ گنا زیادہ گراں ہے تاہم خدا کی مدد کے بھروسے پر ہم اس کام کو آخر وقت تک جاری رکھنے کی کوشش کریں گے۔

جماعت کے لیے جو پریس خریدا گیا ہے وہ اس حالت میں تیار کھڑا ہے کہ بجلی ملتے ہی کام شروع کیا جا سکتا ہے لیکن جنگ کی وجہ سے بجلی کی طاقت حاصل کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے، لہٰذا پریس اس کے انتظار میں ابھی غیر معلوم مدت تک کھڑا ہی رہے گا۔ تعلیمی اسکیم اور کارکنوں کی تربیت کے لیے جو ادارہ میں قائم کرنا چاہتا تھا اسے بھی سر دست اس وجہ سے معرض التوا میں رکھنا پڑا ہے کہ ایک طرف غلہ اور دیگر ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا سخت دشوار ہو رہا ہے اور دوسری طرف طلبہ اور کارکنوں کے قیام کے لیے عمارات میں جو اضافہ ناگزیر ہے اس کے لیے سامان فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جو کچھ سرمایہ اس وقت جماعت کے خزانہ میں ہے اس کو بھی کسی دوسری اسکیم میں استعمال کرنے کے بجائے میں زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تحریک کے کام کو زندہ رکھنے کے لیے استعمال کروں۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت کا بکڈپو اس وقت اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ اس سے تقریباً ۳۰۰ روپے ماہوار منافع حاصل ہو سکتا ہے، اور اس کے علاوہ ہمیں اپنے ہمدردوں سے قریب قریب ڈھائی سو روپیہ ماہانہ بطور اعانت حاصل ہو رہا ہے۔ اگر بکڈپو کو ہم اس خطرے سے بچانے میں کامیاب ہو جائیں جو جنگی حالات کی وجہ سے اس وقت درپیش ہے تو انشاء اللہ آگے چل کر یہ ہماری تحریک کے لیے ایک مستقل ذریعۂ قوت ثابت ہو گا اور اہل خیر کی اعانت کے ساتھ اس کی اور پریس کی آمدنی سے ہم اپنی تحریک کے تعمیری اور انقلابی کام اچھے پیمانے پر شروع کر سکیں گے۔

اس دوران میں کہ رسالہ کی اشاعت بند رہی اور میں اس اشاعت کے کام کو تباہی سے بچانے میں منہمک رہا، شیطان اپنی پوری قوت کے ساتھ فتنہ پھیلانے میں مشغول رہا۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے مجھے پیہم اطلاعات ملتی رہیں کہ جو لوگ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جماعت کے نظام میں شریک ہوئے تھے اور جو بڑی امیدوں کے ساتھ جماعت کے قریب

آرہے تھے، ان میں سخت بددلی پھیلائی جارہی ہے اور ان کو بدگمان کیا جارہا ہے تاکہ مایوس ہو کر اُلٹے پاؤں پھر جائیں رسالہ کی اشاعت بند ہوجانے کی وجہ سے میرے پاس کوئی ذریعہ اس خرابی کی اصلاح کا نہ تھا، اور فرداً فرداً خطوط لکھ کر تمام مستفسرین کو مطمئن کرنا میرے لیے محال تھا، اس لیے خرابی جس حد تک پھیل سکتی تھی خوب پھیلی۔ اب یہ اللہ ہی کا کام ہے کہ جو کچھ بگاڑ پیدا ہوا ہے اس کو وہ درست فرمادے۔ شیطان جیسے آزمودہ کار فتنہ پرداز کے مقابلہ میں ہم ضعیف انسان کہاں کامیاب ہو سکتے ہیں اگر اللہ ہماری مدد نہ کرے۔ شیطان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر اس کام کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ تو اس کے مشن پر براہِ راست ضرب ہے۔ وہ جس طرح بھی ممکن ہو گا اس کو برباد کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا اور جس اللہ کے بندے کو جس راہ سے بھی بہکایا جا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اگر یہ کام ہمارا نہیں بلکہ اللہ کا ہے، جیسا کہ ہمیں یقین ہے، تو آخر اللہ کی مدد ضرور آکر رہے گی اور شیطان کی تدبیروں کے باوجود یہ فروغ پاکر رہے گا۔

میں اس فتنہ کو کچھ اس وجہ سے شیطانی فتنہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس میں مجھے ہدف بنایا گیا ہے۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میں کبھی اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار بناؤں۔ دراصل جس بنا پر میں اس کو شیطان کی فساد انگیزی کا نتیجہ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اوّل تو اس میں وہ طریقے استعمال کیے گئے ہیں جو اہلِ حق کی سی صفائی و راستی سے دُور اور شیطانی تدابیرِ فتنہ انگیزی سے قریب تر ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس پوری حرکت کا میلان بناؤ کے بجائے بگاڑ کی طرف ہے۔ اگر معاملہ یہ ہوتا کہ اس کام کو مجھ سے بہتر طریقہ پر چلانے کے لیے مجھ سے زیادہ اصلح اور اتقی لوگ آگے بڑھتے اور مجھے ہٹا کر میری جگہ لیتے تو یہ ہرگز فتنہ نہ ہوتا بلکہ اس صورت میں اگر مجھے ہلاک بھی کر دیا جاتا تب بھی یہ فتنہ نہیں فضلِ الٰہی ہوتا، مگر یہاں تو صورتِ حال کچھ اور ہی ہے۔ بڑی اونچی اونچی دیندارانہ باتیں کی جاتی ہیں اور نہایت خدا ترسانہ انداز میں کی جاتی ہیں اس لیے نہیں کہ زیادہ بہتر طریقہ پر اقامتِ دین کی سعی کرنے کے لیے ہم آگے آتے ہیں، اور اس لیے بھی نہیں کہ کچھ دوسرے اصلح حضرات آگے آنے کے لیے تیار ہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ جو حقیر سی ابتدا اس کام کی ہوئی ہے اُسے بھی یہیں ختم کر دیا جائے۔ پہلے

ایک گروہ نے یہ کوشش باہر سے کی تھی، اب یہی کوشش ایک دوسرے گروہ نے نظامِ جماعت کے اندر آ کر کی ہے۔ میں کسی کی نیت کے متعلق فیصلہ کرنے کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا۔ ممکن ہے کہ یہ سب حضرات خالص دینی جذبہ ہی سے یہ سب کچھ کر رہے ہوں، لیکن شیطان کے پھندے میں پھنسنے والے تمام لوگ بدنیت ہی نہیں ہوتے، بہت سے نیک نیت بھی ہوتے ہیں اور بسا اوقات نادان متقی، ہوشیار مفسد سے بڑھ کر شیطان کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

جو لوگ دین کی اُن جزدی اور ضمنی خدمات سے مطمئن ہیں جو ہمارے مدارسِ دینیہ میں، یا تبلیغی اداروں اور جماعتوں میں، یا خانقاہوں اور مسجدوں میں ہو رہی ہیں وہ تو بڑی حد تک معذور ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی کسی حد تک معذور ہیں جو انفرادی طور پر حق کا اظہار و اعلان کر دینے اور بندگانِ خدا کو خیر و صلاح کی تلقین کرنے اور بے راہ رَوِیوں پر ٹوک دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کو علیٰ وجہ البصیرت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مطلوب دینِ حق کو ایک مکمل نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم کرنا ہے اور اس کے لیے منظم اجتماعی کوشش کی ضرورت ہے، اور اِس چیز کو واحد نصب العین بنا کر جدوجہد کرنے والا گروہ آج روئے زمین پر کہیں موجود نہیں ہے انھیں کبھی اپنی خلوتوں میں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ ایسے ایک گروہ کو تیار کرنے میں اگر وہ تعمیری عنصر بننے کے بجائے تخریبی عنصر بنیں تو دنیا کو نہیں، خدا کو جواب دینے کے لیے اُن کے پاس کیا عذر ہوگا۔ خصوصاً اس صورت میں وہ کیا جواب دیں گے جبکہ انھیں معلوم ہے کہ اس کام کی بنا ڈالنا کس قدر مشکل اور اسے ایک بار درہم برہم کر کے دوبارہ اس کی صورت بندی کرنا کس قدر مشکل تر ہے۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے قصوروں اور گناہوں اور میری خامیوں اور برائیوں کو وہ اپنی صفائی کے لیے حجت نہ بنا سکیں گے۔ میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں اس کام کی قیادت کا بے استثنیٰ حق رکھتا ہوں اور یہ منصب مجھی کو حاصل ہونا چاہیے۔ میں نے کبھی اسے حاصل کرنے کی کوشش کی نہ اسے رکھنے پر اصرار کیا۔ بارہا کہہ چکا ہوں اور خدا کا واسطہ دے کر کہہ چکا ہوں کہ کوئی مردِ صالح اُٹھے اور اس کام کو سنبھالے۔ یہاں تک کہہ چکا ہوں کہ مجھے صرف اقامتِ دین کی سعی کرنے والی ایک منظم جماعت درکار ہے اور اس میں چپراسی کی حیثیت سے بھی اگر مجھے کام کرنے کا موقع ملے تو میں اس پر راضی ہوں۔ پھر کس بنا پر میرے کسی قصور کو اس کام کی تخریب کے لیے حجت بنایا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی تخریب نہیں تعمیر چاہتا ہو تو اسے انفرادی سرگوشیاں کرتے پھرنے بددلی اور بدگمانی پھیلانے اور ریشہ دوانیاں کرنے کی کیا حاجت ہے، کیوں نہ وہ راستباز انسانوں کی طرح وہ سیدھا اور صاف طریقہ

اختیار کرے جو کسی کام کو بنانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے؟ مفضول کے ہٹائے جانے اور کسی افضل شخص کے رہنما و سربراہ کار بننے میں آخر یہاں کون مانع ہے؟

لیکن پچھلے چند مہینوں میں جس قسم کی ذہنیتوں سے مجھے سابقہ پیش آیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے میں توثق کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایک میں ہی نہیں، شاید کوئی شخص بھی ایسے لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتا جو عدم اطمینان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ ان کو مطمئن وہ کر سکتا ہے جو ہر پہلو سے کامل ہو، جو ان میں سے ایک ایک کے خوردبینی امتحان میں پورا اترے، جس کی ذات میں کسی پہلو کوئی خامی نہ ہو جس پر کسی جہت سے حرف رکھا ہی نہ جا سکے، جس کی کسی بات کو بُرے معنی پہنانے اور جس کی کسی حرکت سے بدگمانی کی گنجائش نکالنے کا یہ موقع نہ پائیں جس کے عیب ڈھونڈنے کے لیے بہت سے لوگ پیچھے پڑے رہیں اور کامیاب نہ ہوں۔ ایسا کوئی اللہ کا بندہ مل جائے گا تو یہ اس کے ساتھ چلیں گے ورنہ اس کم جو بھی اس کام کے لیے اٹھے گا یہ چند روز کے بعد کسی نہ کسی پہلو سے اس میں کوئی خامی دیکھ کر غیر مطمئن ہو گئے، پھر سرگوشیاں کریں گے، خفیہ مجلے دوڑائیں گے، غیبت اور نکتہ چینی کریں گے اور اپنی بے اطمینانی کی چھوت دوسروں کو لگا کر سارے کام کو درہم برہم کر دیں گے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس ذہنیت کے لوگ جمع ہو کر دنیا میں کبھی کوئی تعمیر کر سکتے ہیں۔ گوشت پوست کے انسانوں میں جامع کمالات ہستی کی تلاش محض ایک حماقت ہے۔ جو انسان بھی ہو گا اس کے بعض پہلو قوی اور بعض پہلو کمزور ہوں گے، اس میں بعض صفات ہوں گی مگر نشو و نما کی حالت میں ہوں گی اور بعض صفات سرے سے ہوں گی ہی نہیں، اس کی بہرحال ایک افتاد مزاج ہو گی جو لازم نہیں کہ سب کو موافق آ جائے اور اس میں لامحالہ کچھ خصوصیات ہوں گی جو ضروری نہیں کہ سب کے لیے خوشگوار ہوں۔ اب اگر کسی گروہ کو واقعی کام کرنا ہو تو اس کے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ رہنمائی و قیادت کے لیے ایسا شخص ڈھونڈتا پھرے جس کی واحد ذات میں تمام خوبیاں جمع ہوں اور جب وہ نہ ملے تو سرے سے کام ہی نہ کرے، بلکہ اسے اپنے ذہن میں یہ طے کرنا پڑے گا کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس کے لحاظ سے قیادت کے لیے کن پہلوؤں کا قوی ہونا اور کن صفات و خصوصیات کا موجود ہونا ناگزیر ہے اور کن پہلوؤں کی خامی اور کن صفات و خصوصیات کی کمی یا غیر موجودگی برداشت کی جا سکتی ہے۔ اس طرح تو یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک نہیں تو دوسرے پر لوگ مطمئن ہو جائیں اور کام کیا جا سکے، ورنہ جامع الصفات کی جستجو محض کچھ نہ کرنے کا حیلہ ہے اور کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض لوگ مرد کامل کو ڈھونڈتے ہیں اور وہ نہیں ملتا۔ بلکہ بے اطمینانی کی اس وبا کے دوران میں مجھے

عجیب قسم کے مریضوں کی تشخیص کا موقع ملا ہے۔ ان میں کچھ ایسے صاحب ہیں جو چاہتے ہیں کہ امامت کی ذمہ داری تو کوئی دوسرا سنبھالے مگر پیچھے کی صفوں سے اللہ اکبر اور سمع اللہ لمن حمدہ کی جو صدائیں وہ بلند کریں انہی کے مطابق وہ رکوع و سجود کرتا رہے۔ کوئی دوسرے صاحب ہیں جو چاہتے ہیں کہ ڈرائیور گاڑی کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھتے ہی اس کو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چھوڑ دے ورنہ جو حادثہ بھی پیش آئے تو اس کی ذمہ داری خدا اور خلق دونوں کے سامنے اپنے سر لے۔ کچھ اور لوگ ہیں جن کے ذہن میں ابھی تک پہلے کی تحریکوں و جماعتوں کے طریقے اور ہتھکنڈے بسے ہوئے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہی اس کام میں بھی اختیار کیے جائیں۔ ایک اور قسم کے مریض ہیں جو تعمیر میں کسی قسم کا حصہ نہیں لینا چاہتے بلکہ امیدوں سے لبریز اور مایوسی کے لیے تیار نگاہیں لے کر بنی ہوئی عمارت ڈھونڈتے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عمارت بنانا تنہا میرا کام ہے اور ان کا کام صرف تکمیل شدہ عمارت کو دیکھنا۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اپنے حد کو نہیں سمجھتے اور اپنے دماغ کو وہ کچھ سوچنے بلکہ فیصلہ کر ڈالنے کی تکلیف دیتے ہیں جس کے سمجھنے کی بھی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ ان غریبوں کو بالکل اندازہ نہیں کہ ایک عالمگیر احاطہ رکھنے والے اور گہری بنیادوں پر جمے ہوئے نظام زندگی کے خلاف کسی دوسرے نظام زندگی کو غالب کرنے کے لیے اگر جدوجہد کرنی ہو تو اس کے لیے کن تیاریوں کی ضرورت ہے، کن کن چیزوں پر کس تدریج سے ضرب لگانی چاہیے، کن کن پہلوؤں میں نئی تعمیر کی بنیاد رکھنی چاہیے، اور کن کن مراحل سے اپنی تحریک کو کس طرح سنبھالتے ہوئے لے چلنا چاہیے کہ جہاں تک انسانی تدبیر کا تعلق ہے اس کے ناکام ہونے کا کم سے کم خطرہ ہو۔ ان امور کو نہ وہ خود سمجھتے ہیں، نہ سمجھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، مگر جو شخص رات دن کے غور و فکر سے ایک ایک کام کی بنا رکھتا اور ایک ایک قدم پر پیش قدمی کے لیے نشانات ڈال رہا ہوتا ہے اس کے کام پر نہایت طفلانہ انداز میں بیٹھ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور قسم کے مریض، اور میرے نزدیک سب سے بدتر قسم کے مریض وہ ہیں جو نظم جماعت اور اخلاقی ذمہ داری کے خلاف بدترین حرکات کرنے کے بعد چاہتے ہیں کہ امیر جماعت ان پر سرزنش نہ کرے، جو جماعت کے بیت المال سے معاوضہ لیتے ہیں اور پھر اس معاوضہ کا حق ادا نہیں کرتے، جو اپنے معاشی حوصلوں کی تسکین کے لیے بے تاب ہوتے ہیں اور جب وہ حاصل نہیں ہوتی تو ہر طرف بے اطمینانی کے جراثیم پھیلانے شروع کر دیتے ہیں۔

یہ سب وہ تخریبی عناصر ہیں جن کی آمیزش سے کوئی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ میری جگہ کوئی دوسرا بندۂ خدا بھی اگر اس کام کو کرنے اٹھے گا تو اس کے لیے یہ اسی قدر مصیبت بنیں گے جس قدر میرے لیے ثابت ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں صاف کہتا ہوں کہ اگر جماعت اسلامی کو درحقیقت اپنے نصب العین کے لیے کچھ کرنا ہے تو اسے اپنے آپ کو ایسے تمام فاسد جراثیم سے پاک کرنا چاہیے۔

حساب آمد و خرچ جماعت اسلامی، از یکم ستمبر ۱۹۴۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۴۲ء

تفصیل آمد

بقایا باختتام اگست ۱۹۴۱ء	۷۴-۱۴-۰
فروخت کتب	۷۴۱۳-۱۵-۹
اعانت اہل خیر	۵۹۴۳-۱۳-۹
زکوٰۃ و صدقات واجبہ	۶۱۶-۱۰-۳
قرض	۲۱۴۱-۰-۰
وصولی قرض	۱۵۰-۲-۶
متفرق	۶۶۴-۱۳-۳
میزان آمد	۱۷۰۰۵-۵-۶
میزان خرچ	۱۳۹۶۳-۱۱-۰
بقایا باختتام دسمبر ۱۹۴۲ء	۳۰۴۱-۱۰-۶

تفصیل خرچ

طباعت کتب [۲]	۵۳۶۵-۱۵-۳
خرچ ڈاک	۵۸۹-۱۰-۶
کتب اجنبی	۱۱۹۵-۰-۰
معاوضہ کارکنان	۶۷۴-۰-۰
اشتہار	۲۵-۸-۰
اسٹیشنری	۹۸-۴-۶
سفر خرچ	۲۸۶-۲-۰
مہمان خانہ	۴۶۵-۱۳-۶
اعانت اہل حاجت	۱۵۰-۴-۰
پریس [۳]	۳۱۳۷-۱-۳
قرض جو بعض ارکان ادارہ کو دیا گیا	۲۵۹-۲-۶
ادائے قرض [۴]	۱۴۴۳-۰-۰
عربی تراجم [۵]	۲۰-۰-۰
متفرق	۲۵۲-۱۳-۶
میزان	۱۳۹۶۲-۱۱-۰

[۱] اس کے علاوہ جماعت کے مکتبوں میں ختم سال پر تقریباً چھ ہزار روپیہ کی کتابیں موجود تھیں اور مختلف تاجران کتب اور بیرونی جماعتوں اور اشخاص کے ذمہ بکڈپو کے ۱۷۲۲ روپیہ ایک آنہ چھ پائی واجب الادا تھے۔

[۲] ختم سال پر حسابات کی جانچ سے ۵۷ روپیہ ۲ ر کاغذ کے حساب میں زائد نکلے۔ لہٰذا انھیں متفرق آمدنی میں شامل کر دیا گیا۔ اس طرح طباعت کتب کے واقعی مصارف ۵۳۰۸-۱۳-۳ ہیں۔

[۳] پریس کی خریداری اور حمل ونقل و ضروریات کی فراہمی کے سلسلہ میں جو رقمیں علی الحساب دی گئی تھیں ان میں سے ۴۵۰ روپے بعد میں واپس ہوگئے اور متفرق آمدنی میں شامل کر دیے گئے۔ اس طرح پریس کے حقیقی مصارف ۲۶۸۷-۱-۳ ہیں۔

[۴] نقد ادائیگی کے علاوہ ایک صاحب کے قرض میں ۱۲ روپے بصورت کتب بھی ادا کیے گئے ہیں۔ اس طرح جماعت کے ذمہ واقعی قرض ۶۸۶ روپے ہیں۔

[۵] سال کے اواخر میں مولانا ابوالحسن علی صاحب کے زیر نگرانی جماعت کے لٹریچر کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ ترجمے سب بلا معاوضہ کیے جارہے ہیں۔ یہ رقم صرف تبلیغی اور ممالک عربیہ کے اخبارات و رسائل سے مراسلت پر صرف ہوئی ہے۔

تفہیم القرآن

(۸)

النساء

یہ سورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً سنہ ۳ ہجری کے اواخر سے لے کر سنہ ۴ ہجری کے اواخر یا سنہ ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق کے متعلق ہدایات جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثہ کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شہداء کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انہوں نے چھوڑے ہیں، اُن کے مفاد کا تحفظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہوں گی۔ اسی طرح روایات میں صلوٰۃِ خوف (عین حالتِ جنگ میں نماز پڑھنے) کا ذکر ہمیں غزوۂ ذات الرقاع میں ملتا ہے جو سنہ ۴ ہجری میں ہوا اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے لگ بھگ زمانہ میں وہ خطبہ نازل ہوا ہو گا جس میں اس نماز کی ترکیب بیان کی گئی ہے۔ مدینہ سے بنی نضیر کا اخراج ربیع الاول سنہ ۴ ہجری میں ہوا اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ وہ خطبہ اس سے پہلے قریبی زمانہ ہی میں نازل ہوا ہو گا جس میں یہودیوں کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ "ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر

پیچھے پھیر دیں"۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کی اجازت غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ہجری میں ہوا۔ اس لیے وہ خطبہ جس میں تیمم کا ذکر ہے اسی سے متصل عہد کا سمجھنا چاہیے۔

اس طرح بحیثیت مجموعی سورہ کا زمانۂ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ سورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد لی جاسکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت جو کام تھا، اُسے تین بڑے بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک، اُس نئی منظم اسلامی سوسائٹی کا نشوونما جس کی بنا ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور جس میں جاہلیت کے پرانے طریقوں کو مٹا کر اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور تدبیر مملکت کے نئے اصول رائج کرنے تھے۔ دوسرے، اُس کشمکش کا مقابلہ جو مشرکین عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالف اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدت سے جاری تھی۔ تیسرے اسلام کی دعوت کو ان مزاحم طاقتوں کے علی الرغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس موقع پر جتنے خطبے نازل کیے گئے وہ سب انھی تین شعبوں سے متعلق ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی اس لیے سورۂ نساء کے ان خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح درست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حقوق معین کیے گئے، وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا، معاشی معاملات کی درستی کے متعلق ہدایات دی گئیں، خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا، تعزیری قانون کی بنا ڈالی گئی، شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی، طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے، اور مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرز عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں

ان خطبوں میں مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم و ضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلق ہدایات دی گئیں، اہل کتاب کے اخلاقی و مذہبی رویہ پر تبصرہ کر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنی ان پیش رو امتوں کے نقش قدم پر چلنے سے پرہیز کریں اور منافقین کے طرز عمل پر تنقید کر کے سچی ایمان داری کے متقضیات واضح کیے گئے۔

مخالف اصلاح طاقتوں سے جو کشمکش برپا تھی اُس نے جنگ اُحد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اُحد کی شکست نے اطراف و نواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں، اور گھر کے منافقوں کی ہمتیں بہت بڑھا دی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے پُر جوش خطبوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مقابلہ کے لیے اُبھارا اور تاکید کی کہ ہر وقت کمر بستہ رہیں اور اس کے ساتھ انھیں جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے مختلف ضروری ہدایات بھی دیں۔ مدینہ میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اُڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کر لیں اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سریوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے راستوں سے گذرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو دونوں کے بجائے تیمم کر لیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو وہاں صلوٰۃ خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور بسا اوقات جنگ کی لپیٹ میں بھی آجاتے تھے اُن کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کن تھا۔ اس مسئلہ میں جماعت اسلامی کو تفصیلی ہدایات دی گئیں اور اُن مسلمانوں کو بھی ہجرت پر اُبھارا گیا تاکہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آ جائیں۔ یہودیوں میں

بنی نضیر کا رویہ خصوصیت کے ساتھ نہایت معاندانہ ہوگیا تھا اور وہ معاہدات کی صریح خلاف ورزی کر کے کھلم کھلا دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے رہے تھے اور خود مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رہے تھے۔ ان کی اس روش پر سخت گرفت کی گئی اور انھیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ کر دی گئی جس کے بعد بالآخر مدینہ سے اُن کا اخراج عمل میں آیا۔ منافقین کے مختلف گروہ مختلف طرزِ عمل رکھتے تھے، اور مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس قسم کے منافقوں سے کیا معاملہ کریں۔ ان سب کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کے منافقوں کے متعلق بتا دیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ہونا چاہیے۔ اسی طرح غیر جانبدار معاہد قبائل کے ساتھ جو رویہ مسلمانوں کا ہونا چاہیئے تھا اس کو بھی واضح کیا گیا۔ سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ مسلمان کا اپنا کیرکٹر بے داغ ہو کیونکہ اس کشمکش میں یہ مٹھی بھر جماعت اگر جیت سکتی تھی تو اپنے اخلاقِ فاضلہ ہی کے زور سے جیت سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو بلند ترین اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور جو کمزوری بھی ان کی جماعت میں ظاہر ہوئی اس پر سخت گرفت کی گئی۔

دعوت و تبلیغ کا پہلو بھی اس سورہ میں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام جس اخلاقی و تمدنی اصلاح کی طرف دنیا کو بلا رہا تھا، اس کی توضیح کرنے کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین، تینوں گروہوں کے غلط مذہبی تصورات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس سورہ میں تنقید کر کے ان کو دینِ حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے[1]۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

یتیموں کے مال ان کو واپس دو[2]، اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو[3]، اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

---

[1] چونکہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حقوق بیان کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں اس لیے تمہید اس طرح اٹھائی گئی ہے کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔ "تم کو ایک جان سے پیدا کیا" یعنی نوع انسانی کی تخلیق ابتداً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسل انسانی پھیلی۔

"اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا"، اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو بات اہل تفسیر بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے، اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع کیا جائے۔

[2] یعنی جب تک وہ بچے ہیں، ان کے مال انہی کے مفاد پر خرچ کرو اور جب بڑے ہو جائیں تو جو ان کا حق ہے وہ انھیں واپس کر دو۔

[3] جامع فقرہ ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حلال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے نہ بدل لو۔

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو[۱]۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو[۲] یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں[۳]، بے انصافی

[۱] اس کے تین مفہوم اہل تفسیر نے بیان کیے ہیں:۔

(۱) حضرت عائشہ اس کی تفسیر یہ فرماتی ہیں کہ لوگوں کی ولایت میں جو یتیم بچیاں ہوتی تھیں اُن کے مال اور اُن کے حُسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دنیا میں موجود ہیں، اُن میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان کے ساتھ نکاح کر لو۔

(۲) ابن عباس اور ان کے شاگرد عکرمہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی، ایک ایک شخص دس دس بیویاں تک کر لیتا تھا، اور جب اس کثرتِ ازواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جبیر اور قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے، اہل جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملہ میں اُن کے ذہن عدل و انصاف کے تصور سے خالی تھے جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر ان کے ساتھ ظلم و جور سے پیش آتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اوّل تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے متحمل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد بھی ہوں۔ نیز اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں۔

[۲] اس بات پر فقہائے امت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رُو سے تعدد ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص (جس کا نام غیلان تھا) اسلام لایا اور اس کی نو بیویاں تھیں۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حِصّہ تمھیں معاف کردیں تو اُسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔[۵]

(بقیہ سابق) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص (نوفل بن معاویہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دے۔

نیز یہ آیت تعددِ ازواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دیتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ دغابازی کرتا ہے۔ حکومتِ اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو اُن کی داد رسی کریں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی مسیحیت زدہ رائے سے مغلوب و مرعوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تعددِ ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطۂ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعددِ ازواج کا فی نفسہٖ ایک بُرائی ہونا بجائے خود ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدنی اور اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے، حصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں جس کے نقصانات تمدن و اخلاق کے لیے اُس سے بہت زیادہ ہیں جو تعددِ ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے اُن لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ تاہم جن لوگوں کے نزدیک تعددِ ازواج فی نفسہٖ ایک برائی ہے ان کو یہ تو اختیار حاصل ہے کہ قرآن کے برخلاف اس کی مذمت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں۔ لیکن یہ اختیار انہیں حاصل نہیں ہے کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن کی طرف منسوب کریں، کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کی اجازت دی ہے اور اشارۃً و کنایۃً بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔

[۴] لونڈیاں مراد ہیں، یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو، جیسا کہ رکوع ۴ میں آگے آتا ہے۔ یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمھیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان عدل رکھنا تمھارے لیے مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمہ داریوں کا بار نسبۃً کم پڑے گا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] حضرت عمرؓ اور قاضی شریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو (باقی اگلے صفحہ پر)

اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔[8]

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو[9] یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال اُن کے حوالے کردو۔[10] ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِ انصاف سے تجاوز کرکے اس خوف سے

(بقیہ سابق) مہر یا اس کا کوئی حصہ معاف کردیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر کے لیے دینا لازم ہوگا کیونکہ اُس کا مطالبہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے مہر یا اس کا کوئی حصہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔

(حواشی صفحہ ہذا) [8] یہ آیت وسیع معنی کی حامل ہے۔ اس میں اُمّت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعۂ قیامِ زندگی ہے، بہر حال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرف میں نہ رہنا چاہیے جو اُسے غلط طریقے سے استعمال کرکے نظامِ تمدن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کردیں۔ حقوقِ ملکیت جو کسی شخص کو حاصل ہیں اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کرے تب بھی اس سے وہ حقوق سلب نہ کیے جاسکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری ہونی چاہییں، لیکن جہاں تک حقوقِ ملکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے، اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ استعمال اخلاق و تمدن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانہ پر ہر صاحبِ مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالہ کر رہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانہ پر حکومتِ اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں، اور جو لوگ اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے کر ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کردے۔

[9] یعنی جب وہ سنِ بلوغ کے قریب پہنچ جائیں تو دیکھتے رہو کہ ان کی عقل و تمیز کا کیا حال ہے اور ان میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پائی جاتی ہے۔

[10] مال ان کے حوالہ کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں، ایک بلوغ، دوسرے رُشد یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے اُمّت میں اتفاق ہے۔ دوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سنِ بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو ولیِ یتیم کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے، پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اس کا مال اس کے حوالہ کردینا چاہیے۔ اور امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالہ کیے جانے کے لیے بہر حال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے، اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے[۱۱]۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

مردوں کے لیے اُس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت[۱۲]، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو[۱۳]۔

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو

(بقیہ سابق) غالباً موخرالذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہوگی کہ اس معاملہ میں قاضی شرع سے رجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کے لیے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۱] یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانبدار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے چوری چھپے نہ لے بلکہ علانیہ متعین کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔

[۱۲] یعنی میراث میں جس طرح مردوں کا حصہ ہے اسی طرح عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ اور میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اُسے بھی دس ٹکڑوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔

[۱۳] خطاب میت کے وارثوں سے ہے اور انھیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبہ کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آجائیں ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو، میراث میں از روئے شرع ان کا حصہ نہیں ہے تو نہ سہی، وسعتِ قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

مرتے وقت انھیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے، پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں
اور راستی کی بات کریں۔

جو لوگ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور
جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ ٤

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے:
مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو،[۱]
اگر (میت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکہ کا دو تہائی دیا جائے،[۲]
اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اُس کا ہے،
اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے،[۳]
اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے،[۴]
اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حق دار ہوگی۔[۵]

---

[۱] میراث کے معاملہ میں یہ اولین اصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بار سے سبکدوش رکھا ہے، لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم ہو۔

[۲] یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہرحال اس کے کل ترکہ کا ۲/۳ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا، اور باقی ۱/۳ دوسرے وارثوں میں۔ اسی سے یہ حکم آپ سے آپ نکل آتا ہے کہ اگر میت کا صرف ایک بیٹا ہو تو وہ ۳/۳ کا حق دار ہوگا اور کئی بیٹے ہوں تو وہ ۳/۳ میں شریک ہوں گے۔

[۳] یعنی میت کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بہرحال والدین میں سے ہر ایک ۱/۶ کا حق دار ہوگا خواہ میت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں، یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو، یا ایک بیٹی۔ رہے باقی ۴/۶ تو ان میں دوسرے وارث شریک ہوں گے۔

[۴] ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی ۲/۳ باپ کو ملے گا۔ ورنہ اس ۲/۳ میں باپ اور دوسرے وارث شریک ہوں گے۔

[۵] بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ ۱/۳ کے بجائے ۱/۶ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ سب حصّے اُس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میّت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اُس پر ہو ادا کر دیا جائے۔[۱۶]

تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپوں اور بیٹوں میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے، یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔[۱۷]

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو انہوں نے کی ہو پوری کر دی جائے،

(بقیہ سابق) حصہ میں سے جو ۱/۶ بچتا ہے وہ باپ کے حصہ میں آئے گا کیونکہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۶۔ وصیت کا ذکر قرض پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے، اور وصیت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے، اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔ یعنی اگر میّت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میّت کے ترکہ میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیت پوری کی جائے گی اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وصیت کے متعلق سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ میں گزر چکا ہے کہ آدمی کو اپنے کل مال کے ۱/۳ حصہ کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رُو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصہ نہیں پہنچتا ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو اس کے لیے اپنے اختیارِ تمیزی سے حصہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھاوج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے تو اس کے حق میں وصیت کے ذریعہ سے حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہِ عام کے کام میں صرف کرنے کے لیے وصیت کی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کل ملکیت میں سے ۲/۳ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے جس میں سے شریعت کے نامزد کردہ وارثوں کو مقررہ حصہ ملے گا، اور ۱/۳ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملہ میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرنے کی وصیت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں ظلم کرے، یا بالفاظِ دیگر اپنے اختیارِ تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارۂ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضامندی سے اس کی اصلاح کر لیں یا قاضیِ شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیت کو درست کر دے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا[۱]، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم طلب ہے، بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے[۲]، جبکہ وصیت جو کی گئی ہو، پوری کر دی جائے، اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو[۳]۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے[۴]۔

(بقیہ سابق) [۵] یہ جواب ہے اُن سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اُس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ ⅛ کی، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ¼ کی حصہ دار ہوں گی اور یہ ¼ یا ⅛ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

[۲] باقی ⅚ یا ⅔ جو بچتے ہیں ان میں اگر کوئی اور وارث موجود ہو تو اس کو حصہ ملے گا، ورنہ اس پورے باقی ماندہ ملکیت کے متعلق اس شخص کو وصیت کرنے کا حق ہو گا۔

اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مراد اخیافی بھائی اور بہن ہیں، یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ اُن کا دوسرا ہو۔ رہے سگے بھائی بہن، اور سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں، تو ان کا حکم اسی سورہ کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔

[۳] وصیت میں ضرار یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرار یہ ہے کہ محض حقداروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی اپنے اوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حق دار میراث سے محروم ہو جائیں۔ اس قسم کے ضرار کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے، اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہل جنت کے سے کام کرتا رہتا ہے مگر مرتے وقت وصیت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتاب زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اُسے دوزخ کا مستوجب بنا دیتا ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اُسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اُسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں اُن پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو اُن کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں اُن دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انھیں چھوڑ دو کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) اگرچہ یہ افراط ہر حال میں گناہ ہے، مگر خاص طور پر کلالہ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں اس میں عموماً یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائیداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور نسبتاً دور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کر دے۔

سلہ یہاں اللہ کی صفت حلم کا اظہار دو وجوہ سے کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی نہ بچ سکے گا، دوسرے یہ کہ اللہ نے جو حصے جس طرح مقرر کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کیونکہ بندوں کی مصلحت جس چیز میں ہے، اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اللہ کی صفت حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے تاکہ وہ مشقت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انھیں تا حکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے یعنی مارا پیٹا جائے، سخت سست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا، بعد میں سورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہل عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف تھی کہ ایک قانون تعزیرات بنا کر دفعۃً اُن پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خوگر بنانے کیلیے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں، پھر بتدریج زنا، قذف اور سرقہ کی حدیں مقرر کیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔ اور اسی طرح توبہ اُن کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں[۱]۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔

(بقیہ سابق) اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

مفسر سُدّی کو اِن دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کے لیے ہے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی وزنی دلیل نہیں۔ اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور مرد کے ناجائز تعلق کے بارے میں۔ تعجب ہے ابو مسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کیلیے قانون و اخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور اُنہی مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں۔ رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں، تو اُن کی طرف توجہ کرنا اور اُن پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلام شاہانہ کیلیے ہرگز موزوں نہیں۔ ایسی چیزوں کو اُس نے اجتہاد کیلیے چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلق پر کیا سزا دی جائے تو صحابۂ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سورۂ نساء کی اس آیت میں اس کا حکم موجود ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] توبہ کے معنی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنی رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظرِ عنایت جو پھر گئی تھی وہ ازسرِنو اس کی طرف منعطف ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی صرف اُن بندوں کے لیے ہے جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں، اور جب آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! تمھارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو،[28] اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اُڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمھیں تنگ کرنے کا حق ہے[29])۔ اُن کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اُسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو[30]۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اُسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم

(بقیہ سابق) اس کا دروازہ کھلا پائیں گے کہ

این درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

مگر توبہ ان کے لیے نہیں ہے جو بے خوف و بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں اور پھر عین اس وقت جبکہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو معافی مانگنے لگیں۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر (اللہ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک آثار موت شروع نہ ہوں) کیونکہ امتحان کی مہلت جب پوری ہو گئی اور کتاب زندگی ختم ہو چکی تو اب پلٹنے کا کونسا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے اور دوسری زندگی کی سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [28] اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میت کی میراث سمجھ کر اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔

[29] مال اُڑانے کے لیے نہیں بلکہ بدچلنی کی سزا دینے کے لیے۔

[30] یعنی اگر عورت خوبصورت نہ ہو، یا اس میں کوئی اور ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اُسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے بلکہ حتی الامکان اُسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسن صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اسے اپنی ان خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسن سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے، (باقی اگلے صفحہ پر)

کر کے واپس لوگے؟ اور آخر تم اُسے کس طرح لے لوگے جب کہ تم اپنی بیویوں سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں؟[۱]

اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔[۲] درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے۔[۳] ع

تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں،[۴] بیٹیاں،[۵] بہنیں،[۶] پھوپیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں،[۷]

(بقیہ سابق) لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے تو اس پر خود ثابت ہو جائے گا کہ اس کی بیوی بُرائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارہ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق، یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے پھریں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] پختہ عہد سے مراد نکاح ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمانِ وفا ہے جس کے استحکام پر بھروسہ رکھ کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو اُسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔

[۲] یعنی اب اس پر گرفت نہیں ہوگی بشرطیکہ یہ حکم آجانے کے بعد اس کا ارتکاب کیا جائے اور جن لوگوں نے اس حکم امتناعی سے پہلے اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کیا ہو وہ انھیں چھوڑ دیں۔

[۳] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کو جرم مستلزم سزا قرار دیا تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک شخص کے متعلق جب یہ خبر آپ کو پہنچی کہ اس نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کیا ہے تو آپ نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ جا کر اسے قتل کر دو اور اس کا مال ضبط کر لو۔

[۴] ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی، دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اس لیے دونوں حرام ہیں۔ نیز اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سلف میں سے بعض اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں، اور بعض اسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک جس عورت کو باپ نے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہو، اور تمھاری دودھ شریک بہنیں[۵]، اور تمھاری بیویوں

(بقیہ سابق) شہوت سے ہاتھ لگایا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سلف میں اس امر میں بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں، مگر یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اُس کا باپ یا اُس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی، اس کی نگاہ ہو ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اس معاملہ میں اُن قانونی موشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیر نکاح اور قبل نکاح اور بعد نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے، یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من نظر الی فرج امرأۃ حرمت علیہ امہا وابنتہا، جس شخص نے کسی عورت کے اعضاءِ صنفی پر نظر ڈالی ہو اُس کی ماں اور بیٹی دونوں اُس پر حرام ہیں۔ اور لا ینظر اللہ الی رجل نظر الی فرج امرأۃ وابنتہا، خدا اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضاءِ صنفی پر نظر ڈالے۔ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہو جاتا ہے۔

[۵] بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک وہ بھی جائز بیٹی کی طرح محرمات میں سے ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ محرمات میں سے نہیں ہے۔ مگر درحقیقت یہ تصور بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ جس لڑکی کے متعلق آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ اُسی کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہو۔

[۶] سگی بہن اور ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، تینوں اس حکم میں یکساں ہیں۔

[۷] ان سب رشتوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن خواہ سگی ہو خواہ سوتیلی یا باپ شریک، بہرحال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۸] اس امر پر امت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حرمتِ رضاعت کس قدر دودھ پینے سے (باقی اگلے صفحہ پر)

کی مائیں [۳۹]، اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے [۴۰] — اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن وشو ہو چکا ہو، ورنہ اگر (صرف نکاح ہوا ہو اور) تعلق زن وشو نہ ہوا ہو تو (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے — اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب سے ہوں [۴۱]۔ اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو [۴۲]، مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے [۴۳]۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں (مُحْصَنَاتُ) البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں [۴۴]۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔

(بقیہ سابق) ثابت ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے اتنی ہی مقدار میں اگر بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر امام احمد کے نزدیک تین مرتبہ پینے سے اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ دفعہ پینے سے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۳۹] اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہوا ہو اس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ جب تک کسی عورت سے خلوت نہ ہوئی ہو اس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

[۴۰] ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں ہے کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے محض اس رشتہ کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ فقہائے امت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہرحال حرام ہے خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔

[۴۱] یہ قید اس غرض کے لیے بڑھائی گئی ہے کہ جسے آدمی نے بیٹا بنا لیا ہو اس کی بیوہ یا مطلقہ آدمی پر حرام نہیں ہے۔ حرام صرف اس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صلب سے ہو۔ اور اسی حکم میں پوتے اور نواسے کی بیوی بھی شامل ہے۔

[۴۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی اور پھوپی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔

[۴۳] یعنی جاہلیت کے زمانہ میں تم جو ظلم کرتے رہے ہو کہ دو دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کر لیتے تھے اس پر باز پرس نہ ہوگی بشرطیکہ اب اس سے باز رہو۔ اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ جس شخص نے حالت کفر میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر رکھا ہو وہ اسلام لانے کے بعد ایک کو رکھنا اور ایک کو چھوڑنا ہوگا۔

[۴۴] یعنی جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں اور ان کے کافر شوہر دار الحرب میں موجود ہوں وہ حرام نہیں ہیں کیونکہ دار الحرب سے دار الاسلام میں آنے کے بعد اُن کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کیا جا سکتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انھیں اپنے اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمھارے لیے حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ حصارِ نکاح میں اُن کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو ازدواجی زندگی کا لُطف تم ان سے اُٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو، البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمھارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ علیم اور دانا ہے۔ اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے اُسے چاہیے کہ تمھاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلے جو تمھارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمھارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو[1]۔ لہذا اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور معروف طریقہ سے اُن کے مہر ادا کرو، تاکہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ (محصنات) ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں (محصنات) کے لیے مقرر ہے[2]۔ یہ سہولت[3] تم میں سے اُن لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے

(بقیہ سابق) اور جس کی ملکِ یمین میں وہ ہوں وہ اُن سے تمتع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر میاں اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا کیا حکم ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا، اور امام مالک و شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی معاشرت میں لوگوں کے درمیان جو فرقِ مراتب ہے وہ محض ایک اعتباری چیز ہے، ورنہ دراصل سب مسلمان یکساں ہیں اور اگر کوئی حقیقی وجہِ امتیاز ان کے درمیان ہے تو وہ ایمان ہے جو محض اونچے گھرانوں ہی کا حصہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان و اخلاق میں ایک خاندانی عورت سے بہتر ہو۔

[2] سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور اُن دوسرے لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہوسکتی ہے کہ لونڈی کو دی جائے۔ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا سرے سے ہی نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰتٌ (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک "شادی شدہ عورتیں" جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے "خاندانی عورتیں" جن کو خاندان کی حفاظت (باقی اگلے صفحہ پر)

بندِ تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو، اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گذرے ہوئے صلحاء کرتے تھے، وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔[لہ] ہاں اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ لوگ جو خود اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کر رہے ہیں چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔[سلہ] اللہ تم پر سے پابندیوں

(بقیہ سابق) حاصل ہو اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں "محصنات" کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنی میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے محصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَإِذَا أُحْصِنَّ) تب اُن کے لیے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے، دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی ملک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی۔ نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں، تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہن رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

[سلہ] یعنی خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کسی لونڈی سے اس کے مالکوں کی اجازت لے کر نکاح کر لینے کی سہولت۔

(حواشی صفحہ ہذا) [لہ] سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں اور اس سورہ کے نزول سے (باقی اگلے صفحہ پر)

کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے[51]۔

اے ایمان لانے والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے[52]۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو[53]۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر

(بقیہ سابق) پہلے سورۂ بقرہ میں مسائل تمدن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں ان سب کی طرف بحیثیت مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدن کے وہ قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانہ سے ہر دور کے انبیاء اور ان کے صالح پیرو عمل کرتے چلے آئے ہیں اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقہ زندگی کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔

[50] یہ اشارہ ہے اطراف مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ ان کے ہاں صدیوں سے فقہی موشگافیوں کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا اور بال کی کھال نکال نکال کر جو لمبی چوڑی پیچ در پیچ شریعت ان کے فقیہوں نے تیار کر دی تھی اس کی وجہ سے یہ بات یہودیوں کے علماء اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ اُس سیدھی سادی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ اس لیے قرآن کے احکام کو سُن کر وہ طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر بھی وہی سوال میں سے سوال نکالنے اور جزئیات کو کُرید کُرید کر باریکیاں تلاش کرنے کی بیماری پھیلا دیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [51] اس ایک ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سارے اعتراضات کا جواب دیدیا ہے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ قانون کی جن جکڑبندیوں سے ان یہودیوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کو کس رکھا ہے ان کی بہ نسبت ہم تم پر بہت ہلکی پابندیاں عائد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ کمزور انسان زیادہ قیود اور پابندیوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی مضمون کو سورۂ اعراف (رکوع ۱۹) میں یوں بیان فرمایا ہے کہ یہ پیغمبر ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن سے اُن کو کس رکھا تھا۔

[52] "باطل طریقوں" سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلافِ حق ہوں اور شرعاً و اخلاقاً ناجائز ہوں۔ "لین دین" سے مراد یہ ہے کہ آپس میں مفاد و منافع کا تبادلہ ہونا چاہیے جس طرح تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ "آپس کی رضامندی" سے مراد یہ ہے کہ لین دین کسی ناجائز دباؤ سے نہ ہو اور فریب و دغا سے بھی نہ ہو کہ دوسرے شخص کو بے خبر رکھ کر تم اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھاؤ۔ رشوت اور سود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر فی الواقع وہ رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

مہربان ہے۔[۱] جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے تو تمھاری چھوٹی موٹی بُرائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ساقط کر دیں گے[۲] اور تم کو عزت

(بقیہ سابق) ہوتی ہے۔ جوے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر درحقیقت جوے میں حصہ لینے والا ہر شخص اس غلط اُمید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی، ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ جعل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ اندر جعل و فریب نہیں ہے۔ اگر فریق ثانی کو معلوم ہو کہ تم اس سے جعل یا فریب کر رہے ہو تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔

[۳] یہ فقرہ پچھلے فقرہ کا تتمہ بھی ہو سکتا ہے اور خود ایک مستقل فقرہ بھی۔ اگر پچھلے فقرے کا تتمہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دنیا میں اس سے نظام تمدن خراب ہوتا ہے اور اس کے برے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی بدولت آدمی سخت سزا کا مستوجب بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مستقل فقرہ سمجھا جائے تو اس کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ خودکشی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال کیے ہیں اور ترتیب کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم نکلتے ہیں اور تینوں حق ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی اللہ تعالیٰ تمھارا خیر خواہ ہے، تمھاری بھلائی چاہتا ہے، اور یہ اس کی مہربانی ہے کہ تم کو ایسے کاموں سے منع کرتا ہے جن میں تمھاری اپنی بربادی ہے۔

[۲] یعنی ہم تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پکڑ کر اپنے بندوں کو سزا دیں۔ اگر تمھارا نامۂ اعمال بڑے جرائم سے خالی ہو تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور تم پر فردِ جرم لگائی ہی نہ جائے گی۔ البتہ اگر بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو پھر جو مقدمہ تم پر قائم کیا جائے گا اس میں چھوٹی خطائیں بھی گرفت میں آ جائیں گی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اصولی فرق کیا ہے۔ جہاں تک میں نے قرآن اور سنت میں غور کیا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں:

(۱) کسی کی حق تلفی، خواہ وہ خدا ہو جس کا حق تلف کیا گیا ہے یا والدین ہوں یا دوسرے انسان، یا خود اپنا نفس۔ پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اُسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو "ظلم" بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر شرک کو قرآن میں ظلم عظیم کہا گیا ہے۔

(۲) اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلہ میں استکبار جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا (باقی اگلے صفحہ پر)

کی جگہ داخل کریں گے۔

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اُس کی تمنّا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ، ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔[لہ]

(بقیہ سابق) نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور عمداً اُن کاموں کو نہ کرے جن کا اُس نے حکم دیا ہے۔ یہ نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی اور جسارت اور ناخداترسی کی کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی اسی قدر گناہ بھی شدید ہوگا۔ اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لیے "فسق" اور "معصیت" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۳) اُن روابط کو توڑنا اور اُن تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور درستی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے، خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں یا بندے اور بندے کے درمیان۔ پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملہ میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجیے۔ یہ فعل فی نفسہٖ نظامِ تمدن کو خراب کرنے والا ہے اس لیے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے، مگر اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں شدید تر ہیں۔ شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا بن بیاہے کی بہ نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر والوں سے زنا کرنا غیر ہمسایہ سے کرنے کی بہ نسبت زیادہ بُرا ہے۔ محرمات مثلاً بہن یا بیٹی یا ماں سے زنا کرنا غیر عورت سے کرنے کی بہ نسبت اشنع ہے۔ مسجد میں زنا کرنا کسی اور جگہ کرنے سے اشد ہے۔ ان مثالوں میں ایک ہی فعل کی مختلف صورتوں کے درمیان گناہ ہونے کی حیثیت سے مدارج کا فرق انہی وجوہ سے ہے جو اوپر بیان ہوئے کہ جہاں مامونیت کی توقع جس قدر زیادہ ہے، جہاں انسانی رابطہ جتنا زیادہ مستحق احترام ہے، اور جہاں اس رابطہ کو قطع کرنا جس قدر زیادہ موجب فساد ہے وہاں زنا کا ارتکاب اسی قدر زیادہ شدید گناہ ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لیے "فجور" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) سلہ اس آیت میں ایک بڑی اہم اخلاقی ہدایت ہے جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ کوئی خوبصورت ہے، اور کوئی بدصورت، کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بدآواز، کوئی قوی بازو ہے اور کوئی ضعیف القویٰ، کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے، کسی کو جسمانی اور ذہنی (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ہم نے ہر اُس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ
ع لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انھیں دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں ہے[۱]۔
مرد عورتوں پر قوّام ہیں[۲]، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے[۳]، اور اس
بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ
کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں[۴]۔ اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں

(بقیہ سابق) قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت، کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں، کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدن کی یہ گوناگونی قائم ہے اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے۔ جہاں اس فرق کو اس کے فطری حدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک نوعیت کا فساد رونما ہوتا ہے، اور جہاں اس کو مٹانے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں ایک دوسری نوعیت کا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے بے چین ہو جائے، یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اُسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا اُسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر اُتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمھارے لیے مناسب سمجھے گا عطا فرما دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ "مردوں نے جو کچھ کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ"، اس کا مطلب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے جس کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کو استعمال کر کے جو جتنی اور جیسی بُرائی یا بھلائی کمائے گا اسی کے مطابق، یا بالفاظِ دیگر اسی کی جنس سے اللہ کے ہاں حصہ پائے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اہل عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے وہ ایک دوسرے کی میراث کے حقدار بن جاتے تھے۔ اسی طرح جسے بیٹا بنا لیا جاتا تھا وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔ اس آیت میں جاہلیت کے اس طریقے کو منسوخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وراثت تو اسی قاعدہ کے مطابق رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے، البتہ جن لوگوں سے تمھارے عہد و پیمان ہوں ان کو اپنی زندگی میں تم جو چاہو دے سکتے ہو۔

[۲] قوّام یا قیّم اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگرانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سمجھاؤ، خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو اور مارو[سلہ]، پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔ اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں[سلہ] اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا[سلہ]، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔

(بقیہ سابق) سلہ یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دی ہیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوّام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبرگیری کے تحت رہنا چاہیے۔

سکہ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمھارا جی خوش ہو جائے، جب تم اُسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمھارے پیچھے تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے"۔ یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت سے اہم اور اقدم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شوہر اللہ کی معصیت کا حکم دے یا اللہ کے عائد کیے ہوئے فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا عورت کا فرض ہے، حتّٰی کہ اطاعت کرے گی تو گناہ گار ہوگی۔ البتہ اگر شوہر اپنی بیوی کو نفل نماز یا نفل روزہ ترک کرنے کے لیے کہے تو چاہیے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سہ یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ نشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عمل درآمد تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے، اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے بادلِ ناخواستہ دی ہے اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر درست ہی نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔

سہ دونوں سے مراد ثالث بھی ہیں اور زوجین بھی۔ ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان ہے بشرطیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور بیچ والے بھی دل سے چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

(باقی اگلے صفحے پر)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی، اور پاس بیٹھنے والا دوست، اور مسافر، اور وہ لونڈی یا غلام جو تمھارے قبضہ میں ہو، ہر ایک سے احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں[۵۸]۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے

(بقیہ سابق) [۵۷] اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے وہاں نزاع کے انقطاع تک پہنچنے یا برسر عدالت ان کے خانگی جھگڑوں کا تصفیہ کیے جانے سے پہلے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے، اور وہ تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسباب اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تاکہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں، اور اگر مقدمہ عدالت میں چلا جائے تو قاضی عدالتی کارروائی کرنے سے پہلے اصلاح کے لیے یہ تدبیر اختیار کرے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہاء میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے البتہ تصفیہ کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو اس کے لیے سفارش کر سکتے ہیں، ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہی علماء احناف کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ حسن بصری اور قتادہ اور بعض دوسرے فقہاء کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین، اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۸] اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا کہ اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے، نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے، لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ کی نعمت ناشکری ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخرت پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسر آئی۔ آخر ان لوگوں پر کیا آفت آ جاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہ جاتا۔ اللہ تو ایسا ہے کہ کسی کی ذرہ برابر بھی نیکی ہو تو وہ اس کے ہاں ماری نہیں جاتی، بلکہ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اُسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔[۱] اس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔

اے ایمان لانے والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔[۲] نماز اس وقت پڑھنی چاہیے

(بقیہ سابق) حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اللہ اذا انعم نعمۃ علیٰ عبد احب ان یظہر اثرھا علیہ۔ اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس بندے پر نمایاں ہو یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن، اور اس کی داد و دہش، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا رہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ہر دور کا پیغمبر اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق جس کی تعلیم آپ نے ہمیں دی تھی، ہم نے انھیں بتا دیا تھا، اور اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے دور کے لوگوں پر (اور قرآن تصریح کرتا ہے کہ آپ کا دور آپ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے) اسی چیز کی گواہی دیں گے۔

[۲] یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورۂ بقرہ (رکوع ۲۷) میں گزرا۔ اس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہے تھے حتیٰ کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً سنہ ۴ ہجری کی ابتدا میں یہ دوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہیں

(باقی اگلے صفحہ پر)

جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔[1] اور اسی طرح جنابت[2] کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ غسل نہ کر لو، الّا یہ کہ راستہ سے گذرتے ہو۔[3] اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لمس[4] کیا ہو، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو،[5] بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

(بقیہ سابق) نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت آجائے۔ اس کے کچھ مدت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۂ مائدہ کے رکوع ۱۲ میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سُکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیاء کا استعمال بجائے خود حرام ہے، لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا دوہرا اور عظیم تر گناہ ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اونگھ جاتا ہو تو اُسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔

[2] جنابت کے اصل معنی دوری اور بیگانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں جنابت سے مراد وہ نجاست ہے جو قضاءِ شہوت سے یا خواب میں مادہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

[3] فقہاء اور مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس آیت کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے الّا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو۔ اسی رائے کو عبداللہ بن مسعود، انس بن مالک، حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہ حضرات نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا گروہ اس سے سفر مراد لیتا ہے، رہا مسجد میں قیام، تو ان کی رائے میں جنبی کے لیے وضو کر کے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے۔ یہ رائے حضرت علی، ابن عباس، سعید بن جبیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار فرمائی ہے۔ مگر اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے، اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔

[4] اس امر میں اختلاف ہے کہ لمس یعنی چھونے سے کیا مراد ہے۔ حضرات علی، ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری، اُبی ابن کعب، سعید بن جبیر، حسن بصری اور متعدد ائمہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے اور اسی رائے کو امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام سفیان ثوری نے اختیار کیا ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عبداللہ ابن مسعود اور عبداللہ ابن عمر کی رائے ہے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر ابن خطاب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس سے مراد چھونا یا ہاتھ لگانا ہے اور اسی رائے کو امام شافعی نے اختیار کیا ہے۔ بعض ائمہ نے بیچ کا مسلک بھی اختیار کیا ہے، مثلاً امام مالک کی رائے ہے کہ اگر عورت یا مرد ایک دوسرے کو جذباتِ شہوانی کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو ان کا وضو ساقط ہو جائے گا اور نماز کے لیے انھیں وضو کرنا ہوگا، لیکن اگر جذباتِ شہوانی کے بغیر ایک کا جسم دوسرے سے مس ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جنھیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے[۱] ؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمھاری حمایت و مددگاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں[۲] اُن میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں[۳]، اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا[۴]، اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ[۵] اور

(بقیہ سابق) شہ حکم کی تفصیلی صورت یہ ہے کہ اگر آدمی بے وضو ہے یا اُسے غسل کی حاجت ہے، اور پانی نہیں ملتا تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر مریض ہے اور غسل یا وضو کرنے سے اس کو نقصان کا اندیشہ ہے تو پانی موجود ہونے کے باوجود تیمم کی اجازت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

تیمم کے معنی قصد کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ جو چیز مٹی کی جنس سے ہو اس پر دونوں ہاتھ مار کر ایک دفعہ منہ پر پھیر لیے جائیں، اور پھر دونوں ہاتھ مار کر ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیر لیے جائیں۔ اگرچہ بظاہر ایک سطحی نظر رکھنے والے آدمی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس طرح مٹی پر ہاتھ مار کر منہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حس، اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہر حال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا، پاکیزگی کے جو قوانین شریعت میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا اور اس کے ذہن سے قابلِ نماز ہونے کی حالت اور قابلِ نماز نہ ہونے کی حالت کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] علماء اہلِ کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ "انھیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو انھوں نے کتابِ الٰہی کا ایک بڑا حصہ گم کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ جو کچھ کتابِ الٰہی میں سے اُن کے پاس تھا اُس کی رُوح اور اس کے مقصد و مدعا سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے اور ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دینداری سے خالی تھے اگرچہ علماءِ دین اور پیشوایانِ ملت کہے جاتے تھے۔

[۲] یہ نہیں فرمایا کہ "یہودی ہیں" بلکہ یہ فرمایا کہ "یہودی بن گئے ہیں"، کیونکہ ابتداءً تو وہ بھی مسلمان ہی تھے جس طرح ہر نبی کی امت اصل میں مسلمان ہوتی ہے، مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

[۳] اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردوبدل کرتے ہیں یا اپنی تاویلات سے ان کے معنی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں، اور یہ مطلب بھی ہے کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرووں کی صحبت میں آ کر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقہ سے روایت کرتے ہیں، بات کچھ کہی جاتی ہے اور اسے اپنی شرارت سے (باقی اگلے صفحہ پر)

رَاعِنَا[۴]، حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا[۵] اور اِسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا تو یہ انہی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راستبازی کا طریقہ تھا، مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اے وہ لوگو جنھیں کتاب دی گئی تھی! مان لو اس کتاب کو جو ہم نے نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا[۶]، اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا[۷]، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے[۸]۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا۔

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگیِ نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (انھیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی، یہ اللہ پر بھی جھوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریحاً گناہ گار ہونے کے لیے یہی ایک گناہ

(بقیہ[۳]) کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں تاکہ انھیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو ایمان لانے سے روکا جائے۔

[۴] یعنی جب انھیں خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں سَمِعْنَا (ہم نے سن لیا) اور آہستہ کہتے ہیں عَصَیْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا)۔ یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفظ اس انداز سے زبان کو لچکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَیْنَا بن جاتا ہے۔

[۵] یعنی دوران گفتگو میں جب کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں اِسْمَعْ (سنیے) اور پھر ساتھ ہی غَیْرَ مُسْمَعٍ بھی کہتے ہیں جو ذو معنی ہے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلاف مرضی نہیں سنائی جا سکتی، دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کوئی کچھ سنائے، اور ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] رَاعِنَا پر مفصل نوٹ سورۂ بقرہ (رکوع ۱۳) میں گزر چکا ہے۔

[۲] یعنی ہم نے سنا اور مان لیا۔

[۳] سبت والوں کا ذکر سورۂ بقرہ رکوع ۸ میں گزر چکا ہے۔

[۴] یہ اس لیے فرمایا کہ اہلِ کتاب اگرچہ انبیاء اور کتبِ آسمانی کی پیروی کے مدعی تھے مگر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کافی ہے

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ اور ان کا حال یہ ہے کہ جِبت ملہ
اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ملہ
ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت
میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ ملہ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے
حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے اُنھیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ ملہ اگر یہ بات ہے تو انھیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو

(بقیہ سابق) ملہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے، بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک، جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتٰی کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علماء یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ ان کا سارا وقت اُن جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک اُن کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات و اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انھیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ملہ جِبْت کے اصلی معنی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش)، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور مہورت اور تمام دوسری وہمی و خیالی باتوں کو "جبت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے العیافۃ والطرق والطیر من الجبت۔ یعنی جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے نشاناتِ قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب "جبت" کے قبیل سے ہیں۔ پس "جبت" کا مفہوم وہی ہے جسے ہم اُردو زبان میں اوہام کہتے ہیں اور جس کے لیے انگریزی میں (Superstitions) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ملہ علماء یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اُن کو وہ مشرکینِ عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہ راست پر ہیں، حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں اور دوسری طرف صریح بُت پرستی ہے جس کی مذمت سے تورات بھری پڑی ہے۔

ملہ یعنی کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصہ ان کے قبضہ میں ہے کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسرِ ہدایت ہے اور کون نہیں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی کیونکہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔* مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا،* اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو،* اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انھیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال درپیش ہے اور اس میں بھی یہ بخل سے کام لے رہے ہیں۔

* یعنی یہ اپنی نااہلی کے باوجود اللہ کے جس فضل اور جس انعام کی آس خود لگائے بیٹھے تھے، اس سے جب دوسرے لوگ سرفراز کر دیے گئے اور عرب کے اُمیوں میں یہ عظیم الشان نبی کے ظہور سے وہ روحانی و اخلاقی اور ذہنی و عملی زندگی پیدا ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ عروج و سربلندی ہے، تو اب یہ اس پر حسد کر رہے ہیں اور یہ باتیں اسی حسد کی بنا پر ان کے منہ سے نکل رہی ہیں کہ خدا پرستوں کے مقابلہ میں بُت پرستوں کو زیادہ برسرِ ہدایت قرار دیتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) * "ملک عظیم" سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوامِ عالم پر قائدانہ اقتدار ہے جو اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

* یہ خیال رہے کہ جواب بنی اسرائیل کی حاسدانہ باتوں کا دیا جا رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جلتے کس بات پر ہو؟ تم بھی ابراہیم کی اولاد ہو اور یہ اہلِ عرب بھی ابراہیم ہی کی اولاد ہیں۔ ابراہیم سے دنیا کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا وہ آلِ ابراہیم میں سے صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت پہلے ہم نے تمھارے پاس بھیجی تھی مگر تمھاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسماعیل کو دی ہے اور یہ اُن کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے
صاحبِ امر ہوں [۹۰]، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو
۵۹ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے [۹۱]

(بقیہ سابق) خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

[۸۸] اوپر بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ اب روئے سخن ان کی طرف سے پلٹ کر مسلمانوں کی طرف پھر گیا ہے اور ان کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ان بُرائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نا اہل، کم ظرف، پست حوصلہ، حریص اور رذیل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ ان کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی رُوح سے خالی ہو گئے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پوج رہے تھے، بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبہ کے گرد مادر زاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، مگر ان نام نہاد اہلِ کتاب کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلہ میں یہ دوسرا گروہ زیادہ بر سرِ ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ انکی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کبھی ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۹۰] یعنی مسلمانوں کی جماعت میں سے جو لوگ بھی اجتماعی معاملات انجام دینے کے ذمہ دار ہوں انکی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔

[۹۱] یعنی تمھارے ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کا طریق کار تمھارے لیے آخری فیصلہ کن چیز ہو اور ہر اختلافِ رائے کے موقع پر تم اسی مرکزی اقتدار اور اسی منبعِ علم کی طرف رجوع کرتے رہو۔ یہ نہ صرف تمھارے ایمان کا لازمی تقاضا ہے بلکہ اسی میں تمھاری خیر بھی ہے، ورنہ خدا اور رسول کی سند سے بے نیاز ہو جانے کے بعد تمھارے لیے کوئی ایسی متفق علیہ سند باقی نہ رہیگی جو صحیح بھی ہو اور متفق علیہ بھی۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو تمھاری جمعیت پراگندہ ہو جائیگی یا اگر کسی کی اطاعت و پیروی پر تم متفق ہو بھی گئے تو وہ تمھیں گمراہ کر کے دین کی صراطِ مستقیم سے ہٹا لے جائیگا۔ مسلمانوں کے لیے یہ نصیحت بجائے خود نہایت قیمتی ہے مگر یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کرنے کے بعد اس کا ذکر بہت معنی خیز ہے۔ یہودیوں میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اول تو انھوں نے خدا اور اس کے رسولوں کی اطاعت میں سخت کوتاہیاں کیں، حتیٰ کہ کھلی کھلی نافرمانیوں تک اتر آئے، پھر کتابِ الٰہی اور طریقِ انبیا کی سند سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی سرداروں کو ارباب من دون اللہ بنا بیٹھے جسکی وجہ سے پوری اُمت گمراہ بھی ہوئی اور فرقوں میں تقسیم ہو کر پراگندہ اور بالآخر ذلیل و خوار بھی ہو کر رہ گئی۔

مقالات

اسلام میں مرتد کا حکم

کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغ کفر کی اجازت ہے ؟

(۳)

۳- قتل مرتد پر عقلی بحث اب ہمیں سوال کے دوسرے پہلو سے بحث کرنی ہے، یعنی یہ کہ اگر اسلام میں واقعی مرتد کی سزا قتل ہے اور اگر وہ فی الواقع اپنی حدود میں کسی مقابل دعوت کے اُٹھنے اور پھیلنے کا روادار نہیں ہے، تو ہمارے پاس وہ کیا دلائل ہیں جن کی بنا پر ہم اس کے اس رویہ کو صحیح و معقول سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے قتل مرتد کے مسئلہ پر گفتگو کریں گے پھر تبلیغ کفر کی ممانعت کے سوال کو لیں گے۔

قتل مرتد پر زیادہ سے زیادہ جو اعتراضات ممکن ہیں وہ یہ ہیں :-

اولاً، یہ چیز آزادی ضمیر کے خلاف ہے۔ ہر انسان کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ جس چیز پر اس کا قلب مطمئن ہو اُسے قبول کرے اور جس چیز پر اس کا اطمینان نہ ہو اُسے قبول نہ کرے۔ یہ آزادی جس طرح ایک مسلک کو ابتداءً قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں ہر آدمی کو ملنی چاہیے اسی طرح ایک مسلک کو قبول کرنے کے بعد اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کے معاملہ میں بھی حاصل ہونی چاہیے۔ جو شخص کسی مسلک کی پیروی اختیار کرنے کے بعد اُسے چھوڑنے پر آمادہ ہوتا ہے وہ آخر اسی بنا پر تو آمادہ ہوتا ہے کہ پہلے اس مسلک کے برحق ہونے کا جو یقین اُسے تھا وہ اب نہیں رہا۔ پھر یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ عدمِ یقین کی بنا پر جب وہ اس مسلک کو چھوڑنے کا ارادہ کرے تو اس کے سامنے پھانسی کا تختہ پیش کر دیا جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تم جس شخص کی رائے دلائل کے زور سے نہیں بدل سکتے اس کو موت کا خوف دلا کر مجبور کرتے ہو کہ اپنی رائے بدلے اور اگر وہ نہیں بدلتا تو اسے اس بات کی سزا دیتے ہو کہ اس نے اپنی رائے کیوں نہ بدلی۔

ثانیاً، جو رائے اس طرح جبراً بدلی جائے، یا جس رائے پر سزائے موت کے خوف سے لوگ قائم رہیں وہ بہرحال ایماندارانہ رائے تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی حیثیت محض ایک ایسے منافقانہ اظہار رائے کی ہو گی جسے جان بچانے کے لیے مکر کے طور پر اختیار کیا گیا ہو۔ آخر اس مکاری و منافقت سے ایک مذہب کس طرح مطمئن ہو سکتا ہے؟ مذہب و مسلک خواہ کوئی سا بھی ہو، اس کی پیروی کوئی معنی نہیں رکھتی اگر آدمی سچے دل سے اس پر ایمان نہ رکھتا ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ زبردستی کسی کے اندر

پیدا نہیں کیا جا سکتا نہ زبردستی باقی رکھا جا سکتا ہے۔ زور، زبردستی سے آدمی کی گردن ضرور جھکوائی جا سکتی ہے لیکن دل و دماغ میں اعتقاد و یقین پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا جو شخص اندر سے کافر ہو چکا ہو وہ اگر سزائے موت سے بچنے کے لیے منافقانہ طریقہ سے بظاہر مسلمان بنا رہے تو اس کا فائدہ کیا ہے؟ نہ وہ اسلام کا صحیح پیرو ہو گا، نہ خدا کے ہاں یہ ظاہری اسلام اس کی نجات کا ذریعہ ہو سکتا ہے اور نہ ایسے شخص کے شامل رہنے سے مسلمانوں کی جماعت میں کسی صالح عنصر کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ثالثاً، اگر اس قاعدہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ ایک مذہب اُن تمام لوگوں کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے جو ایک مرتبہ اس کے حلقہ اتباع میں داخل ہو چکے ہوں، اور اُس کے لیے اپنے دائرہ سے نکلنے والوں کو سزائے موت دینا جائز ہے، تو اس سے تمام مذاہب کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند ہو جائے گا اور خود اسلام کے راستہ میں بھی یہ چیز سخت رکاوٹ بن جائے گی، کیونکہ جتنے انسان ہیں وہ بہرحال کسی نہ کسی مذہب و مسلک کے پیرو ضرور ہیں، اور جب ہر مذہب ارتداد کی سزا قتل تجویز کریگا تو صرف یہی نہ ہو گا کہ مسلمانوں کے لیے کسی دوسرے مذہب کو قبول کرنا مشکل ہو گا بلکہ اسی طرح غیر مسلموں کے لیے بھی اسلام کو قبول کرنا مشکل ہو جائے گا۔

رابعاً، اس معاملہ میں اسلام نے بالکل ایک متناقض رویہ اختیار کیا ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ) جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے (فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ)، اور دوسری طرف وہ خود ہی اس شخص کو سزائے موت کی دھمکی دیتا ہے جو اسلام سے نکلکر کفر کی طرف جانے کا ارادہ کرے۔ ایک طرف وہ نفاق کی سخت مذمت کرتا ہے اور اپنے پیروؤں کو صادق الایمان دیکھنا چاہتا ہے، دوسری طرف وہ خود ہی ایسے مسلمانوں کو جن کا اعتقاد اسلام پر سے اُٹھ گیا ہو موت کا خوف دلا کر منافقانہ اظہار ایمان پر مجبور کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ان غیر مسلموں کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے جو اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے سے روکتے ہیں، دوسری طرف وہ خود مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تمہارے ہم مذہبوں میں سے جو کسی دوسرے مذہب میں جانا چاہے اُسے قتل کر دو۔

یہ اعتراضات بظاہر اتنے قوی نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو تو ان کے مقابلہ میں ہار مان کر شکست خوردہ لوگوں کی اس پرانی پالیسی پر عمل کرنا پڑا کہ اپنے دین کے جس مسئلے پر معترضین کی گرفت مضبوط پڑے اُسے اپنی کتابِ آئین میں سے

چھپ ڈالو اور صاف کہہ دو کہ یہ مسئلہ سرے سے ہمارے دین میں ہے ہی نہیں۔ رہا دوسرا گروہ جس کے لیے پہلے گروہ کی طرح حقیقت کا انکار کر دینا ممکن نہ تھا، سو اُس نے امر واقعی کے اظہار کا حق تو ادا کر دیا، لیکن اِن عقلی اعتراضات کا کوئی معقول جواب اس سے بن نہ پڑا حتیٰ کہ اس کی کمزور دلیلوں سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ بات بیٹھ گئی کہ قتلِ مرتد کا حکم اسلام میں ہے تو ضرور مگر اسے معقول ثابت کرنا مشکل ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اب سے تقریباً ۱۸ برس پہلے جب ہندوستان میں ایک موقع پر قتلِ مرتد کا مسئلہ زور شور سے چھڑ گیا تھا اور چاروں طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تھی اس وقت مولانا محمد علی مرحوم جیسا پکا مسلمان بھی ان دلائل سے شکست کھائے بغیر نہ رہ سکا، اور علماء میں سے متعدد بزرگوں نے اگرچہ مسئلہ ویسا ہی بیان کیا جیسا کہ فی الواقع وہ تھا مگر اعتراضات کے جواب میں ایسی بے جان دلیلیں پیش کیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ خود بھی اپنے دلوں میں اس مسئلے کو عقلی حیثیت سے کمزور محسوس کر رہے ہیں۔ اس ضعیف مدافعت کے اثرات آج تک باقی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی حیثیت فی الواقع اُسی معنی میں ایک "مذہب" کی ہوتی جس معنی میں یہ لفظ آجکل بولا جاتا ہے تو یقیناً اس کا اُن لوگوں کے لیے قتل کی سزا تجویز کرنا سخت غیر معقول فعل ہوتا جو اس کے اصولوں سے غیر مطمئن ہو کر اس کے دائرہ سے باہر نکلنا چاہیں۔ مذہب کا موجودہ تصور یہ ہے کہ مابعد الطبیعی مسائل کے متعلق ایک عقیدہ و خیال جسے آدمی اختیار کرتا ہے اور حیات بعد الموت میں نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ جس پر انسان اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ رہی سوسائٹی کی تنظیم اور معاملاتِ دنیا کی انجام دہی اور ریاست کی تشکیل تو وہ ایک خالص دنیوی معاملہ ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس تصور کے مطابق مذہب کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہے اور رائے بھی ایسی جو زندگی کے ایک بالکل ہی دور از کار پہلو سے تعلق رکھتی ہے جس کے قائم ہونے اور بدلنے کا کوئی قابلِ لحاظ اثر حیاتِ انسانی کے بڑے اور اہم شعبوں پر نہیں پڑتا۔ ایسی رائے کے معاملہ میں آدمی کو آزاد ہونا ہی چاہیے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ امور مابعد الطبیعت کے بارے میں ایک خاص رائے کو اختیار کرنے میں تو وہ آزاد ہو، مگر جب اس کے سامنے کچھ دوسرے دلائل آئیں جن کی بنا پر وہ سابق رائے کو غلط محسوس کرنے لگے تو اسے بدل دینے میں وہ آزاد نہ ہو۔ اور اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ جب ایک طریقہ کی پیروی میں اُسے اپنی نجاتِ اُخروی کی توقع ہو تو وہ اُسے اختیار کر سکے اور جب وہ محسوس کرے کہ نجات کی امید اس راستہ میں نہیں، کسی دوسرے راستہ میں ہے تو اُسے پچھلے راستہ کو چھوڑنے

اور نئے راستے کے اختیار کرلینے کا حق نہ دیا جائے۔ پس اگر اسلام کی حیثیت بھی ہوتی جو مذہب کی حیثیت آجکل قرار پا گئی ہے تو اس سے زیادہ نامعقول کوئی بات ہوتی کہ وہ آنے والوں کے لیے تو اپنا دروازہ کھلا رکھے مگر جانے والوں کے لیے دروازے پر جلاد بٹھا دے۔

لیکن دراصل اسلام کی یہ حیثیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہ اصطلاحِ جدید کے مطابق محض ایک "مذہب" نہیں ہے بلکہ ایک پورا نظامِ زندگی ہے، اُس کا تعلق صرف مابعد الطبیعت ہی سے نہیں ہے بلکہ طبیعیات اور ماتحت الطبیعت سے بھی ہے، وہ محض حیات بعد الموت کی نجات ہی سے بحث نہیں کرتا بلکہ حیات قبل الموت کی فلاح و بہتری اور تشکیلِ صحیح کے سوال سے بھی بحث کرتا ہے۔ مانا کہ پھر بھی وہ ایک رائے ہی ہے مگر وہ رائے نہیں جو زندگی کے کسی دور دراز کے پہلو سے تعلق رکھتی ہو بلکہ وہ رائے جس کی بنیاد پر پوری زندگی کا نقشہ قائم ہوتا ہے، وہ رائے نہیں جس کے قائم ہونے اور بدلنے کا کوئی قابلِ لحاظ اثر زندگی کے بڑے اور اہم شعبوں پر نہ پڑتا ہو بلکہ وہ رائے جس کے قیام پر تمدن اور ریاست کا قیام منحصر ہے اور جس کے بدلنے کے معنی نظامِ تمدن و ریاست کے بدل جانے کے ہیں، وہ رائے نہیں جو صرف انفرادی طور پر ایک شخص اختیار کرتا ہو بلکہ وہ رائے جس کی بنا پر انسانوں کی ایک جماعت تمدن کے پورے نظام کو ایک خاص شکل پر قائم کرتی ہے اور اسے چلانے کے لیے ایک ریاست وجود میں لاتی ہے۔ ایسی رائے اور ایسے نظریہ کو انفرادی آزادیوں کا کھلونا نہیں بنایا جاسکتا اور نہ اُس جماعت کو، جو اس رائے پر تمدن و ریاست کا نظام قائم کرتی ہے، ہرگز بنایا جاسکتا ہے کہ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھے تو اس میں داخل ہوجائیے اور جب دوسری لہر اُٹھے تو اس سے نکل جائیے اور پھر جب جی چاہے اندر آئیے اور جب جی چاہے باہر چلے جائیے۔ یہ کوئی کھیل اور تفریح نہیں ہے جس سے بالکل ایک غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر دل بہلایا جائے۔ یہ تو ایک نہایت سنجیدہ اور انتہائی نزاکت رکھنے والا کام ہے جس کے ذرا ذرا سے نشیب و فراز سوسائٹی اور اسٹیٹ کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس کے بننے اور بگڑنے کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا کی زندگیوں کا بناؤ اور بگاڑ وابستہ ہوتا ہے، جس کی انجام دہی میں ایک بہت بڑی جماعت اپنی زندگی و موت کی بازی لگاتی ہے۔ ایسی رائے اور ایسی رائے رکھنے والی جماعت کی رکنیت کو انفرادی آزادیوں کا کھلونا دنیا میں کب بنایا گیا ہے اور کون بناتا ہے کہ اسلام سے اس کی توقع رکھی جائے۔

یہ منظم سوسائٹی اور ریاست کی عین فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لیے اپنے حدودِ عمل میں مشکل ہی سے گنجائش نکال سکتی ہے جو اساسیات میں اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ فروعی اختلافات تو کم و بیش برداشت کیے جاسکتے ہیں، لیکن جو لوگ سرے سے

ان بنیادوں ہی سے اختلاف رکھتے ہوں جن پر سوسائٹی اور ریاست کا نظام قائم ہوا ہو، اُن کو سوسائٹی میں جگہ دینا اور اسٹیٹ کا جزر بنانا سخت مشکل ہے۔ اسلام نے اس معاملہ میں جتنی رواداری برتی ہے کسی دوسرے نظام نے نہیں برتی۔ دوسرے جتنے نظام ہیں وہ اساسی اختلاف رکھنے والوں کو یا تو زبردستی اپنے اصولوں کا پابند بناتے ہیں یا انھیں بالکل فنا کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اسلام ہی ہے جو ایسے لوگوں کو ذمی بنا کر اور انھیں زیادہ سے زیادہ ممکن آزادیٔ عمل دے کر اپنے حدود میں جگہ دیتا ہے اور ان کے بہت سے ایسے اعمال کو برداشت کرتا ہے جو براہ راست اسلامی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی اساس سے متصادم ہوتے ہیں۔ اس رواداری کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے، وہ خدا کے بندوں سے آخر وقت تک یہ اُمید وابستہ رکھتا ہے کہ جب انھیں دینِ حق کے ماتحت رہ کر اس کی نعمتوں اور برکتوں کے مشاہدہ کا موقع ملے گا تو بالآخر وہ اس حق کو قبول کر لیں گے جس کی روشنی فی الحال انھیں نظر نہیں آتی۔ اسی لیے وہ صبر سے کام لیتا ہے اور اُن سنگریزوں کو جو اس کی سوسائٹی اور ریاست میں حل نہیں ہوتے اس امید پر برداشت کرتا رہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی قلبِ ماہیت ہو جائے گی اور وہ تحلیل ہونا قبول کر لیں گے۔ لیکن جو سنگریزہ ایک مرتبہ تحلیل ہونے کے بعد پھر سنگریزہ بن جائے اور ثابت کر دے کہ وہ سرے سے اس نظام میں حل ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، اس کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں کہ اُسے نکال کر پھینک دیا جائے۔ اس کی انفرادی ہستی خواہ کتنی ہی قیمتی ہو، مگر بہرحال وہ اتنی قیمتی تو نہیں ہو سکتی کہ سوسائٹی کے پورے نظام کی خرابی اس کی خاطر گوارا کی جائے۔

قتلِ مرتد کو جو شخص یہ معنی پہناتا ہے کہ یہ محض ایک رائے کو اختیار کرنے کے بعد اسے بدل دینے کی سزا ہے وہ دراصل ایک معاملہ کو پہلے خود ہی غلط طریقہ سے تعبیر کرتا ہے اور پھر خود ہی اس پر ایک غلط حکم لگاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکا ہوں، مرتد کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تنظیم جس بنیاد پر کی گئی ہے اس کو وہ نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرتا بلکہ اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اسے قبول کرے گا۔ ایسے شخص کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لیے اُس بنیاد کو ناقابلِ قبول پاتا ہے جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے تو خود اس کے حدود سے نکل جائے۔ مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے لیے دو ہی علاج ممکن ہیں، یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت میں

مبتلا رہے۔ اور اس صورت میں سوسائٹی کے لیے بھی وہ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی ذات سے ایک مستقل فتنہ لوگوں کے درمیان پھیلتا رہے گا اور دوسرے صحیح و سالم اعضا میں بھی اس کے زہر کے سرایت کرنے کا اندیشہ ہوگا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ اسے موت کی سزا دے کر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔

قتل مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلوّن کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں اور جن کی رائے اور سیرت میں وہ استحکام سرے سے موجود ہی نہیں ہے جو ایک نظام زندگی کی تعمیر کے لیے مطلوب ہوتا ہے۔ کسی نظام زندگی کی تعمیر ایک نہایت سنجیدہ کام ہے، جو جماعت اس کام کے لیے اٹھے اس میں لہری طبیعت کے کھلنڈرے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، اس کو صرف ان لوگوں سے مرکب ہونا چاہیے جو واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس نظام کو قبول کریں اور جب قبول کر لیں تو دل و جان سے اس کے قیام اور اس کی تعمیر میں لگ جائیں۔ لہٰذا یہ عین حکمت و دانش ہے کہ ہر اس شخص کو جو اس جماعت کے اندر آنا چاہے، پہلے ہی مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے، تاکہ وہ داخل ہونے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ آیا اسے ایسی جماعت میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس طرح جماعت میں آئے گا ہی وہ جسے کبھی باہر جانا نہ ہوگا۔

تیسرے نمبر پر جو اعتراض ہم نے نقل کیا ہے اس کی بنیاد بھی غلط ہے۔ معترضین کے پیش نظر دراصل ان "مذاہب" اور ان کے پرچار کا معاملہ ہے جن کی تعریف ہم ابتدا میں کر چکے ہیں۔ ایسے مذاہب کو واقعی اپنا دروازہ آنے اور جانے والوں کے لیے کھلا رکھنا چاہیے۔ وہ اگر جانے والوں کے لیے اسے بند کر دیں تو ایک بے جا حرکت کریں گے۔ لیکن جس مذہبِ فکر و عمل پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر کی گئی ہو اسے کوئی معقول آدمی، جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو، یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی تخریب اور اپنے اجزائے تعمیر کے انتشار اور اپنی بندش وجود کی برہمی کا دروازہ خود ہی کھلا رکھے۔ منظم سوسائٹی اور اسٹیٹ، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا بنانا اور بگاڑنا ہمیشہ ہی سے جان جوکھوں کا کام رہا ہے اور اپنی عین فطرت کے لحاظ سے یہ کام ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کی امید ہے کہ آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر کسی نظام زندگی کو تبدیل کر دیا جائے۔ کسی مزاحمت کے بغیر خود تبدیل ہونے کے لیے صرف وہی نظام زندگی تیار ہو سکتا ہے جس کی جڑیں گل چکی ہوں اور جس کی بنیادیں اپنے استحقاق وجود

وبقا کا یقین باقی نہ رہا ہو۔

رہا تناقض کا اعتراض تو اوپر کی بحث کو بغور پڑھنے سے بڑی حد تک وہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لیے مجبور نہیں کرتے، اور واقعی ہماری روش یہی ہے، مگر جسے آکر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لیے کھلا ہوا نہیں ہے لہذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ کوئی بتائے کہ آخر اس میں تناقض کیا ہے؟ بلاشبہ ہم نفاق کی مذمت کرتے ہیں اور اپنی جماعت میں ہر شخص کو صادق الایمان دیکھنا چاہتے ہیں، مگر جس شخص نے اپنی حماقت سے خود اس دروازے میں قدم رکھا جس کے متعلق اُسے معلوم تھا کہ وہ جانے کے لیے کھُلا ہوا نہیں ہے وہ اگر نفاق کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اس کو اس حالت سے نکالنے کے لیے ہم اپنے نظام کی بربادی کا دروازہ نہیں کھول سکتے۔ وہ اگر ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر نہیں رہنا چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لیے کیوں نہیں پیش کرتا؟ ہاں یہ اعتراض بظاہر کچھ وزن رکھتا ہے کہ اسلام جب خود اپنے پیروؤں کو تبدیلِ مذہب پر سزا دیتا ہے اور اُسے قابلِ مذمت نہیں سمجھتا تو دوسرے مذاہب کے پیرو اگر اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے پر سزا دیتے ہیں تو وہ ان کی مذمت کیوں کرتا ہے۔ لیکن ان دو رویوں میں بظاہر جو تناقض نظر آتا ہے فی الواقع وہ نہیں ہے، بلکہ اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی رویہ اختیار کیا جاتا تو البتہ تناقض ہوتا۔ اسلام اپنے آپ کو حق کہتا اور بالکل خلوص کے ساتھ حق ہی سمجھتا ہے اس لیے وہ حق کی طرف آنے والے اور حق سے منہ موڑ کر واپس جانے والے کو مساوی مرتبہ پر ہرگز نہیں رکھ سکتا۔ حق کی طرف آنے والے کے لیے یہ حق ہے کہ اس کی طرف آئے اور جو اس کی راہ میں مزاحمت کرتا ہے وہ مذمت کا مستحق ہے۔ اور حق سے واپس جانے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ اسے واپس جائے اور جو اس کی راہ روکتا ہے وہ مذمت کا مستحق نہیں ہے۔ تناقض اس رویہ میں نہیں ہے، البتہ اگر اسلام اپنے آپ کو حق بھی کہتا اور پھر ساتھ ہی اپنی طرف آنے والے اور اپنے سے منہ موڑ کر جانے والے کو ایک ہی مرتبہ میں رکھتا تو بلاشبہ یہ ایک متناقض طرزِ عمل ہوتا۔

(باقی)

مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی)

(۲)

(۲) قدیم ترین زمانہ سے دنیا میں دو مقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت (اگرچہ اس میں صدہا قسم کی غلامیاں شامل ہیں)۔ دوسرے انسان کی عبدیت، اس کی خدا کے سامنے ذمہ داری و جواب دہی اور وحی و تعلیمات پیغمبر کی پیروی کی دعوت۔ پہلی دعوت کا نام اسلام کی وسیع اصطلاح میں جاہلیت ہے، اور دوسری دعوت خود اسلام کی ہے۔ ان دونوں دعوتوں کی دنیا کی مختلف جماعتیں اور قومیں اپنے اپنے وقت میں علمبردار رہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے دوسری دعوت (اسلام) کی امامت قیامت تک کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کے نام لکھدی گئی، اور پہلی دعوت کی قیادت وقتاً فوقتاً دنیا کی مختلف جاہلی قومیں اور تہذیبیں کرتی رہیں یہاں تک کہ تقریباً دو سو برس سے تقدیر الٰہی نے اس کی قیادت و امامت کا فیصلہ یورپ کی عیسائی قوموں کے حق میں کیا۔ اس وقت سے مسیحی (لیکن دراصل مادّی) یورپ نے جاہلیت کی عالمگیر نمائندگی اور ایسی طاقت اور ایسے اسلحہ کے ساتھ اس کی قیادت کی کہ اس سے صدیوں پہلے ہمارے علم میں کسی قوم نے نہیں کی تھی۔ طبعی طور پر زندگی کے ہر شعبہ اور متمدن دنیا کے تقریباً ہر میدان میں ان دونوں مقابل دعوتوں اور قوموں کے نمائندوں اور علمبرداروں کا تصادم پیش آیا۔ لیکن مختلف علمی، ذہنی اور سیاسی اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت بہت تفصیل طلب ہے، دوسری دعوت (اسلام) کے نمائندوں نے محض اپنی کمزوریوں کی بنا پر یورپ کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ ان کے اعلیٰ درجہ کے سرسبز اور اہم ممالک اُن کے ہاتھوں سے نکل کر یورپین قوموں کے قبضہ میں چلے گئے۔ ان کا عالمگیر سیاسی اقتدار ختم ہوگیا۔ سمندروں اور خشکی پر سے ان کا تفوق اُٹھ گیا۔ ان کی بین الاقوامی ساکھ جاتی رہی اور

اُن کو تقریباً دنیا کے ہر حصہ میں اور خود اپنے ممالک میں بدترین قسم کی غلامی اور قومی ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔
پھر رفتہ رفتہ ان کے دماغ بھی مفتوح اور غلام ہونے لگے۔ مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر حملہ کیا، مسلمانوں کے قومی اوصاف اور اخلاقی محاسن جو ان کی سلطنتوں اور شاداب ملکوں سے زیادہ بیش قیمت تھے ایک ایک کرکے مٹانے شروع کیے اور ان کی جگہ بدترین انسانی عیوب اور اخلاقی کمزوریاں جو بُت پرست یونان و روم اور تاریک یورپ اور ملحد نشاۃِ ثانیہ سے اس کے حصہ میں آئی تھیں اُن پر مسلط کر دیں۔ پھر انھوں نے ان مفتوحوں کے دین و ایمان پر حملے شروع کیے۔ ان کی دینی تعلیمات اور ان کے اصول و احکامِ شریعت کا استہزا کیا، ان کو لبسا اوقات تثلیث پرست اور بعض اوقات ملحد و بے دین بنانے کی کوشش کی اور ان میں خود بڑی حد تک ایک ایسی با اثر جماعت پیدا کر دی جو ان کے دین و تہذیب سے باغی تھی اور جو اندر اندر ان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش میں تھی۔ غرض فاتح نے مفتوح کو ہر طرح سے غیر مسلح، غیر منظم اور ناتواں کر دیا اور اس کے ہر سرمایہ اور ہر ملکیت کو تاوانِ جنگ یا مالِ غنیمت میں وصول کرنے کی کوشش کی۔ فاتح نے اپنی ذہانت اور دوربینی سے اس حقیقت کا پورے طور پر ادراک کیا کہ اس زمین کے اوپر مسلمانوں سے بڑھ کر اس کا کوئی حریف نہیں، اس لیے یا تو اس نے اس حریف کا سر کچلنے کی کوشش کی اور جہاں اس سے یہ نہ ہو سکا وہاں اس نے اس حریف کو اپنا مستقل حلیف اور بدرجہ مجبوری بے ضرر خادم بنانے کی کوشش کی۔

یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اس مکمل شکست، اس مغلوبیت و ذلت اور اس نقصانِ عظیم کا جو ان کو پہنچا طبعی و نفسیاتی اثر کیا ہونا چاہیے تھا؟ ہر صحیح الفطرت انسان کہے گا کہ مسلمانوں کے دل میں یورپ کی قوموں کی طرف سے سخت عناد اور جذبۂ انتقام پیدا ہونا چاہیے تھا، اور اُن کو بھی ان قوموں کو اپنا مستقل حریف، حقیقی مدمقابل اور عالمگیر دشمن سمجھنا چاہیے تھا، اور اس کی کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ مقابل دعوت کی عالمگیر نمائندگی کی طاقت سے محروم ہو جائے، اس کا اقتدار اس حد تک ختم ہو جائے کہ اس کی تحریک و دعوت میں کوئی کشش اور کمزور انسانوں کے لیے کوئی کشمکش باقی نہ رہے اور دنیا میں دو

دعوتیں برابر کی باقی نہ رہیں بلکہ صرف ایک دعوت رہے اور وہ دعوت الی اللہ ہے،

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

یہاں تک کہ فتنہ (کفار کا غلبہ) باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے۔

ان کی دعا یہ ہونی چاہیے تھی:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ

اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو آرائش اور دولتیں بخش رکھی ہیں، اے ہمارے پروردگار (اس کا نتیجہ یہ ہے) کہ وہ تیرے راستہ سے لوگوں کو بھٹکائیں، اے ہمارے پروردگار ان کی دولتوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔

ان کو دنیا کے ہر حصہ میں یورپین تہذیب اور یورپین طاقت کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے تھا کہ وہ دنیا میں دعوتِ جاہلیت کی علمبردار ہے اور اس کی قوت کی وجہ سے دعوتِ الٰہی کو فروغ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہی عالمگیر مسئلہ ہونا چاہیے تھا اور ہر مسئلہ اسی مرکزی مسئلہ کا جزء ہونا چاہیے تھا۔ ان کو ہر ملک میں اپنے کو دعوتِ اسلام کا عالمگیر نمائندہ سمجھنا چاہیے تھا اور ہر ملکی، قومی، سیاسی مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے تھا اور وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے تھا جو اس عالمگیر دعوت کے نمائندوں کو شایانِ شایان ہے۔ ان کو کوئی ایسا موقف اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا جس سے اس عالمگیر حریف اور اس جاہلی تحریک و دعوت کو کسی قسم کی تقویت و امداد حاصل ہو، خواہ محدود ملکی مسائل اور وطنی و قومی مصالح کا تقاضا کچھ ہو۔ ان کو کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا جس سے اس نظام کی طرف ان کا میلان اور اس کے علمبرداروں کے ساتھ ان کا اتحاد اور محبت ظاہر ہو۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔

اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جنھوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تم کو بھی آگ لگ جائے گی اور اللہ کے مقابلہ میں تمھارا کوئی مددگار نہ ہوگا اور کسی طرف سے تمھیں مدد نہ مل سکے گی۔

لیکن کس قدر حیرت و تاسف کا مقام ہے (وہ تاسف و تحیر جو بقول حضرت علیؓ قلب کو مردہ، دماغ کو معطل، اور غموں اور فکروں کو بڑھا دیتا ہے) کہ یہ عظیم الشان حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے یہ مسئلہ اپنی اس مرکزیت اور عمومیت کے ساتھ ان کے ذہن سے صاف نکل گیا ہے۔ اپنی اور اپنے تاریخی اور مستقل عالمگیر حریف کی یہ صحیح پوزیشن اُن کی نظر سے بالکل مخفی ہے۔ دو سو برس کی خونچکاں تاریخ جو فتح و شکست اور واقعات و حوادث کا مرقع ہے ان کے حافظہ سے بالکل محو ہو گئی ہے۔ وہ اس حقیقتِ واقعی کو بالکل بھول گئے ہیں کہ وہ اور مغربی قومیں دو مقابل دعوتوں، دو متضاد نظامِ حیات، اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں، اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا اونچا ہوگا، ان میں سے ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود، ان کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لیے ایک مستقل مزاحمت، ایک مسلسل خطرہ اور ایک مستمر کشمکش ہے۔ اس امرِ واقعی کا اہلِ مغرب کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں۔ اس حقیقت کو قرآنِ حکیم نے کس صراحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ

اے ایمان لانے والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو اور دوستی کا اظہار کرتے ہو حالانکہ تمھارے پاس جو دینِ حق آچکا ہے اس کے وہ منکر ہیں اور رسول اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو، جلاوطن کرتے ہیں۔ اگر تم میرے راستہ پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی کی طلب میں

أَعْلَنتُمْ ۚ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ إِن يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝ (ممتحنہ - ۱)

نکلے ہو تو ان سے تمھیں دوستی نہ رکھنی چاہیے۔ تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو حالانکہ مجھے ان سب چیزوں کا اچھی طرح علم ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہ راست سے بھٹکے گا۔ اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو وہ کھل کر تمھارے دشمن ہو جائیں اور تمھاری طرف برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں۔ وہ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ۔

اس موقع پر ایک مسلمان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے اور اس کے ایمان اور غیرتِ دینی کا تقاضا کیا ہے؟

اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہی آیت کے بعد کہا گیا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (ممتحنہ - ۱)

تمھارے لیے ابراہیمؑ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان میں عمدہ نمونہ ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو بیزار ہیں، ہم تمھارے منکر ہیں اور ہم میں تم میں عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اہلِ کفر کو تو اس فرق و اختلاف کا احساس ہو اور اپنے دین و مسلک کے لیے محبت و غیرت زیادہ ہو اور وہ اپنے مخالفین سے کبھی اتحاد و موالات کے لیے تیار نہ ہوں مگر اہلِ ایمان ذرا سی مصلحت سے ان کے ساتھ موالات کرنے لگیں۔ اس فرق کو بھی قرآن نے بیان کیا ہے:

هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ (آل عمران)

ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ اُن سے محبت کرتے ہو مگر وہ تم سے قطعاً محبت نہیں رکھتے۔

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ

تم سے یہودی اور عیسائی اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے

حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ (البقرہ) جب تک تم ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جاؤ۔

اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہ سہی لیکن اجمالی طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اب سے کچھ مدت پہلے تک بے دین ولا مذہب یورپ اور اس کی حیوانی تہذیب و نظام کے لیے نفرت موجود تھی۔"کافر فرنگی" نفرت و حقارت کے لیے ضرب المثل تھا۔ لیکن ہم کو اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہیے کہ اس چالیس برس کے عرصہ میں مغربی تعلیم و تہذیب نے بتدریج اس نفرت کو کم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ نفرت کے بجائے رغبت پیدا کر دی۔ اس تبدیلی کی پوری ایک تاریخ ہے۔ پہلے اس نے مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کیا، مغرب کا بالعموم تفوق ذہن پر قائم کیا، اس کا پورا نظام نہایت خوشنما اور آراستہ کر کے دکھایا، پھر اس کی محبت کو قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیا کہ تعلیمیافتہ مسلمان کے لیے اس سے انحراف مشکل ہو گیا، یہاں تک کہ سیاسی طور پر اگر اس کو اس سے اختلاف بھی ہو تو ذہنی اور تہذیبی حیثیت سے اس کا ربط اس سے قائم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمان کی ذہنیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ اس کو دنیا میں اگر اپنا کوئی حلیف اور سرپرست نظر آتا ہے تو وہ صرف یورپین طاقت۔ اس نے اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں جو روزِ روشن کی طرح ہے کہ اس کا اصلی اور عالمگیر حریف جس سے پہلی صدی ہجری سے اس چودھویں صدی ہجری تک مسلسل معرکہ آرائی رہی اور جو دنیا کی قیادت اور اس کی تعمیر نو میں اس کا اصلی رقیب اور مزاحم ہے وہ یورپ ہے۔ اس نے اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا کہ جب تک یورپ کا سیاسی اقتدار دنیا میں قائم ہے اس وقت تک دین کی دعوت پورے طور پر سرسبز نہیں ہو سکتی، اور اس میں وہ طاقت اور جذب و کشش نہیں پیدا ہو سکتی جس کی وہ مستحق ہے۔ جب تک یورپ تنہا دنیا کے لیے مقتدا اور پیشوا ہے اس وقت تک انسانی محاسن و فضائل اور اسلام کے معیار اخلاق کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام کی اور بالتبع انسانیت کی عین مصلحت یہ ہے کہ یورپ کو منصب قیادت سے معزول کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور چونکہ مسلمان ہی دنیا کے اخلاق اور صلاح و فساد کے ذمہ دار ہیں اور وہی دنیا کے محتسب ہیں اس لیے یورپ کو اس منصب سے ہٹانا تنہا ان ہی کا فریضہ ہے۔ اور یہ مسلمانوں ہی کا

منصب ہے کہ یورپ کو رہنمائی و سرداری کے مقام سے ہٹا کر دنیا کی زمام قیادت خود سنبھالیں۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمان مسائل پر اس نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کرتے اور ان کو اپنی صحیح حیثیت یاد ہی نہیں۔ وہ یورپ کو پورے طور پر بے نقاب ہو جانے کے بعد بھی پہچان نہیں سکے۔ ان کی نظر اب بھی محدود اور کوتاہ ہے۔ وہ قومی مصلحتوں اور محدود جغرافی مسائل میں اس عالمگیر ضرورت کو بھولے ہوئے ہیں اور وہ بہترین فرصت ضائع کر رہے ہیں جو تاریخ میں صدیوں میں پیش آتی ہے۔

(۳) مسلمانوں پر اس وقت ایک نظر ڈالنے سے ایک عام ذہنی و نفسی کیفیت نظر آتی ہے جسے پورے طور پر الفاظ میں ادا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن شاید قریب تر الفاظ یہ ہوں کہ "کچھ کیے بغیر سب کچھ پا جانے کی خواہش" گویا استعارہ کی زبان میں مسلمان بیٹھے بیٹھے شطرنج کی ایسی چال چلنا چاہتے ہیں کہ دفعۃً بازی مار لیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان سیاست میں دیر میں آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے سیاست کا مفہوم محض انجمن آرائی، تجاویز کی منظوری، اظہار رائے اور زیادہ سے زیادہ اظہار ناراضگی سمجھا جس سیاست کی بنیاد آج سے ۳۰-۴۰ سال پہلے پڑی تھی اس کا مزاج اور خمیر تمام تر یہی تھا، بلکہ درحقیقت یورپ میں بھی اُس وقت (جب انتخابی اور جمہوری زندگی کا آغاز تھا) سیاست کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ مگر اس کے بعد سے تمام دنیا کے حالات بہت سرعت کے ساتھ بدل گئے۔ اب سیاست نام جد و جہد اور ایثار و قربانی کا ہے۔ مگر مسلمانوں میں تبدیلی بہت دیر میں واقع ہوتی ہے، اور عجیب بات ہے کہ ان کا سب سے زیادہ بدلنے والا طبقہ سب سے کم بدلنے والا ہے اور سب سے زیادہ متحرک اور ترقی پسند جماعت سب سے زیادہ جامد اور ساکن واقع ہوئی ہے چنانچہ تحریک خلافت کے چند سالوں کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ محض جلسوں، تقریروں، تجاویز، بیانات، وفود، اور یادداشتوں (میمورنڈم) کی روداد ہے۔ انھوں نے مغربی سیاست کا جو سبق یاد رکھا ہے وہ صرف یہ کہ سیاست نام ہے دماغی ذہانت، قانونی قابلیت، سیاسی حاضر دماغی، اور حسنِ تقریر کا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ مجلسی (پارلیمنٹری) سیاست کے لیے تو مفید ہے مگر خارجی اور عملی سیاست اور

انقلابی جدوجہد کچھ اور چاہتی ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔

اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتنی ذہنی پستی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ شماتت (دشمن کی مصیبت پر خوشی) پر اتر آئے ہیں۔ تربص دوائر (گردشِ زمانہ کا انتظار) ان کا شیوہ ہو گیا ہے۔ اخلاقی طاقت اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ وہ دوسروں کی جرأت وجاں بازی اور ایثار و قربانی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے اور اس کے ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ کوئی قوم کسی صحیح یا غلط مقصد کے لیے کوئی قربانی کر رہی ہے چہ جائیکہ ان میں اس سے اپنے صحیح اور بلند مقصد کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ صورتِ حال بھی تشویش کی باعث ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں پر اپنی کمزوری اور ناتوانی کا احساس اتنا طاری کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کو کسی جدوجہد اور قربانی کا اہل نہیں سمجھتے اور کسی قسم کے خطرات کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ انھوں نے یقین کر لیا ہے کہ مسلمان خربوزہ کی طرح ہیں جس کے لیے ہر حال میں خطرہ ہی خطرہ ہے، اس لیے نہ وہ چھری پر گرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ چھری کو اپنے اوپر گرنے دینا چاہتے ہیں۔ نیز اُن کو دوسری طاقت پر اعتماد کرنے کا ایسا عادی کر دیا گیا ہے کہ وہ خدا پر بھروسہ کرنے اور اعتماد علی النفس کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال وقتی اور عارضی نہیں ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں ان حالات میں مسلمانوں کی مجاہدانہ روح اور ان کا جذبۂ سرفروشی ایک مدتِ طویل کے لیے سرد نہ ہو جائے اور وہ توکل علی اللہ اور پھر اعتماد علی النفس کے جوہر سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہ مسلمانوں کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی تلافی آسانی سے ممکن نہ ہوگی۔

مسلمانوں کی یہ اپنے آپ سے مایوسی اور اعتماد علی الغیر، اپنی کمزوری کا ضرورت سے زیادہ احساس اور دوسروں کی طاقت کا ضرورت سے زائد اندازہ، اور اقلیت و اکثریت کے مسائل سے شب و روز کا یہ انہماک انگریزی تعلیم و تہذیب اور مغربی سیاست کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو ایک جامد قوم دیکھنے کی عادی ہے اور جو اعداد کے طلسم سے کسی طرح نکل نہیں سکتی اور جو ایمان و توکل کی دولت سے محروم ہے۔ اس زہر کا تریاق قرآن و حدیث

کی اشاعت ہے جب تک مسلمان کی سیاست قرآن وحدیث پر مبنی تھی اور اس کے دماغ و دل اور روح پر ان کا اثر تھا اس میں اتنا عزم و توکل اور خدا کے وعدوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس سے خارقِ عادت افعال صادر ہوتے تھے محمد بن قاسم فاتح سندھ اور طارق بن زیاد فاتح اندلس کے واقعات کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیت:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تمہیں بالا و برتر ہو اگر تم مومن ہو۔

اور

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

جن لوگوں کے سامنے رہتی تھی اور ان کا اس پر ایمان تھا انھوں نے مٹھی بھر جماعتوں سے ملکوں کو فتح کر لیا اور وہاں کی تہذیب، زبان اور معاشرت کو بالکل بدل دیا۔ آج بھی صرف قرآن وحدیث کی اشاعت ہی مسلمانوں میں اعتماد اور قلب کی طاقت پیدا کر سکتی ہے۔

صحابہ کرام اور مجاہدینِ اسلام کے حالات وواقعات کی اشاعت بھی اس نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے خصوصاً ماضی قریب کے عالی ہمت مجاہدین کے سوانح وحالات مثلاً حضرت سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل شہید، شیخ سنوسیؒ، محمد بن عبدالکریم ریفی، جنھوں نے قریب تر ماضی میں نہایت قلیل طاقت اور رفقاء کی بہت تھوڑی تعداد کے ساتھ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کیا اور ایمان کی طاقت اور عزم و توکل کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ جو لوگ سیاسی تحریکوں سے ہٹ کر مسلمانوں میں تعمیری اور تعلیمی کام کر رہے ہیں ان کو اس ضرورت کی طرف جلد متوجہ ہونا چاہیے کہ یہ مسلمانوں کی کسی سیاسی خدمت سے کم اہم کام نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کی سیاست کی صحیح بنیاد ہے اور اسی پر ان کے مستقبل کی تعمیر ہو گی۔

(۴) مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جوہر جس نے کسی غلط چیز کو عام طور پر مسلمانوں پر مسلط ہونے سے روکا اور قیادت کی کسی کمزوری سے یا شخصی رائے اور فیصلہ کی غلطی کی وجہ سے ان کو ہلاک ہونے سے محفوظ رکھا وہ ان کی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ ضمیر کا جوہر یا غلط چیز سے انکار کر دینے کی طاقت اور شریعت کا یہ زریں اصول تھا کہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت صحیح نہیں ہے)۔ اسی کا مظاہرہ تھا کہ حضرت عمرؓ کو برسر منبر ایک بڑھیا اور عرب کا ایک بدو ٹوک دیتا تھا اور وہ اس کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی شخصی سلطنت کے بڑے سے بڑے دورِ استبداد و جبر میں بھی مسلمانوں کی آزادیٔ رائے کبھی سلب نہیں ہوئی اور بادشاہوں کے غلط فیصلوں اور خلفاء کی غلطیوں کے خلاف علماءِ حق نے ہمیشہ آواز بلند کی جس سے دین و شریعت اور مسلمانوں کے عام مزاج و طبائع میں تحریف نہیں ہو سکی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن المسیب، حسن بصری، سعید بن جبیر، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل کے واقعات تاریخ اسلام میں روشن رہیں گے۔

اسلام میں مطلق و غیر مشروط اطاعت صرف اللہ و رسول کی ہے، باقی کسی انسان کی اطاعت غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ کسی خلافِ شریعت فیصلہ اور کسی ایسے حکم کی تعمیل میں جس سے دین اور امت کو یقینی طور پر نقصان پہنچتا ہو اطاعت جائز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجاہدین کی ایک جماعت پر ایک صحابی کو سردار بنایا اور لوگوں کو اس کی اطاعت و تعمیلِ حکم کی تاکید کی۔ راستہ میں سردار کو اپنے ساتھیوں سے کچھ شکایت پیدا ہو گئی۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو، پھر اس میں آگ لگائی اور الاؤ تیار کیا، پھر لوگوں سے کہا کہ کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اطاعت و تعمیلِ حکم کی تاکید نہیں کی تھی؟ لوگوں نے اقرار کیا۔ اس نے کہا تو پھر میرا حکم ہے کہ اس آگ میں کود پڑو۔ لوگوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ خودکشی حرام ہے اور فعلِ حرام میں آپ کی اطاعت ہمارے لیے ضروری نہیں۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپؐ نے

لوگوں کے فعل کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس آگ میں کود جاتے تو ہمیشہ اسی میں رہتے۔ لیکن اب ادھر چند سالوں سے مسلمانوں میں سیاسی شخصیت پرستی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے قائدوں کے احکام اور فیصلوں کی کسی قسم کی تنقید کے لیے تیار نہیں اور ہر غلط اور صحیح حکم کی تعمیل اور اس کی توجیہ و تاویل اپنا اسلامی فریضہ سمجھنے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قائد کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے اور مسلمانوں میں رائے اور اختلاف کی آزادی بعض دور میں بے اعتدالی اور فوضویت (انارکی) یا خارجیت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن جب قائد مسائل اسلامیہ میں اعلیٰ البصیرت اور رسوخ نہ رکھتا ہو اور سیاستِ اسلامی میں تقویٰ و تدیّن کے ساتھ تفقہ واجتہاد کی قابلیت اس کو حاصل نہ ہو اس وقت اپنے کو کالمیتِ فِی یَدِ الغسّال (مردہ بدستِ زندہ) کے طور پر اس کے حوالہ کر دینا صحیح نہیں ہے اور بڑے عظیم دینی و سیاسی خطرات کا باعث ہے۔

یہ چند کمزور پہلو ہیں جو ہم کو اس وقت کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی سیرت میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جو سیاسی جماعتوں اور مسلکوں کی حمایت یا مخالفت کے جذبہ سے بالکل علیحدہ ہو کر پیش کیے گئے ہیں۔ اس کا محرک اسلامی احساس اور دردِ دل کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی جرائد و رسائل سے گذارش ہے کہ وہ اس مضمون کو بجنسہٖ یا اختصار کے ساتھ شائع کر کے ایک بڑی اسلامی خدمت انجام دیں یا ان مقاصد اور معروضات کو (خواہ کچھ تنقید و اختلاف کے ساتھ) اپنے طور پر اپنے الفاظ و مضامین میں پیش کریں۔

اِطلاع

صوبہ پنجاب کیلئے ہم نے اپنی مطبوعات کی سول ایجنسی شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہور کو دیدی ہے۔ ان کے سوا اگر کوئی صاحب تاجر ان کتب کو ۲۰ فیصدی یا اس سے زائد کمیشن دیں۔ ان کی حیثیت مال مسروقہ فروخت کرنے والے کی ہو گی۔

مینجر ترجمان القرآن

مطبوعات

آج کا مصر تالیف پروفیسر محمد حسن الاعظمی و عبدالسلام خورشید بی، اے۔ ملنے کا پتہ اردو اکادمی لاہور

پروفیسر محمد حسن اعظم گڈھ کے رہنے والے، جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ اور جامعہ مصریہ قاہرہ میں اردو کے لیکچرر ہیں۔ کتاب میں معلومات انہی کی فراہم کردہ ہیں۔ شروع میں عہد فراعنہ اور عہد فاطمیین کے مصر کے کچھ حالات ہیں۔ تالیف کا بقیہ حصہ موجودہ مصر کی علمی، سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے مصری زندگی کے چند ظواہر بیان کر دینے پر اکتفا کی ہے اور ان سے بھی وہ کچھ ضرورت سے زیادہ متاثر ہیں۔

مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ دہلی۔ ضخامت ۲۲۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ کتاب خانہ پنجاب۔ لاہور۔

یہ مولانا کے یورپ کے سفروں میں لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ شروع کے چند خطوط اس سفر سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ مولانا حادثۂ کانپور کے وقوع پذیر ہونے کے بعد انگلستان گئے تھے۔ اس سفر کا مقصد حکومتِ برطانیہ کو مسلمانوں کی بے چینی اور ناراضگی سے باخبر کرنا تھا۔ مولانا کو اس دفعہ اربابِ حکومت سے بہت زیادہ توقعات تھیں اور ان تمام خطوط میں ایک طرح کی رجائیت پائی جاتی ہے۔ بقیہ خطوط کا زیادہ تر حصہ ان خطوں پر مشتمل ہے جو مولانا نے سفرِ صحت کے دوران میں عزیزوں کو لکھے۔ اس دفعہ سیاسی مصروفیتیں نہیں تھیں اس لیے علاج اور سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مولانا نے جو کچھ دیکھا، سُنا یا محسوس کیا اُسے قلمبند کر دیا ہے۔

حکومتِ الٰہی تالیف مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ مونگیر۔ بہار۔

یہ کتاب دراصل مولانا محمد سجاد مرحوم (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) کی ایک نامکمل تصنیف "حکومتِ الٰہی کا مکمل نظام" کی تمہید ہے۔ افسوس کہ مولانا یہ تمہید لکھنے کے بعد اور تصنیف کو مکمل کرنے سے پہلے فوت ہو گئے۔ اس تالیف میں مولانا نے سب سے پہلے تہذیب و تمدن کے لیے اجتماعی نظام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے۔ اور

پھر یہ بتایا ہے کہ انسان کے تعمیر کردہ نظام کیوں اس ضرورت کو پورا کرنے سے عاجز ہیں۔ پھر یہ دکھایا ہے کہ انسانی فلاح وبہبود کے لیے موزوں ترین واضع قوانین خالق ارض وسموات ہی ہوسکتا ہے۔ کتاب کا عام انداز اتنا علمی اور تحقیقی نہیں جتنا کہ موضوع کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ تاہم جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ ناشر صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا کی اصل کتاب کے اشارات ان کے پاس محفوظ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ بھی مرتب کر کے شائع کر دیے جائیں۔

نثارِ خواجہ | مرتبہ مولانا معین الدین اجمیری۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت عہ ر۔

یہ خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح عمری ہے۔ اگرچہ کتاب میں کراماتی عنصر کم ہے تاہم زندگی کے اہم تاریخی واقعات مثلاً خواجہ صاحب کے ورود ہند سے قبل کے حالاتِ زندگی جنھوں نے ان کی سیرت کی تعمیر کی، اور ہند میں ان کی تبلیغ واشاعت کے طریق کار کی اس میں کوئی تفصیل نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یا تو تفحص کے ساتھ ان بزرگان دین کی زندگی کے تمام اہم واقعات کو سلسلہ وار مرتب کیا جائے، یا پھر چند واقعات جو مل سکتے ہیں وہ بس واقعات ہی کی حیثیت سے پیش ہوں۔ اگر ان واقعات کو "سوانح عمری" کی شکل میں پیش کیا جائے تو پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی عظمت انہی چند واقعات پر مبنی ہے۔ اور ان کی زندگی انہی چند واقعات تک محدود ہے۔

اقبال اور حدیثِ جبر و قدر | از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

یہ ایک مختصر سا مقالہ ہے جس میں جبر و قدر کے مسئلہ پر اقبال کے چند خیالات کو جمع کیا گیا ہے۔

Pakistan & Untouchability | مصنفہ چودھری افضل حق مرحوم۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

ملنے کا پتہ مکتبہ اردو لاہور۔

کتاب انگریزی زبان میں ہے۔ اس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو منافرت کی خلیج حائل ہو چکی ہے اس کی وجہ مذہبی اختلاف نہیں کیونکہ عوام میں مذہبی عنصر کی کارفرمائی بہت کم ہے (مصنف نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ مسلم عوام کا مذہب ہندو عوام کے مذہب سے

کچھ مختلف نہیں) بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ہندو مسلمان کو معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے "اچھوت" سمجھتا ہے۔
یہ سب صحیح ہے لیکن کتاب کا لب و لہجہ کچھ اس طرح Apologetic ہے گویا کہ ہندوؤں سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے" ہمارا تمہارا مذہبی اختلاف تو کب کا مٹ چکا۔ اگر تم ذرا فراخ دلی یا مصلحت سے کام لیتے اور ہم سے معاشی اور معاشرتی مقاطعہ نہ کرتے، تو ہم تم سب ایک ہو جاتے، مگر افسوس کہ تم نے ایسا نہ کیا" مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت کے رکن رکین کا اس طرز پر سوچنا ہمارے لیے سخت تعجب اور افسوس کا باعث ہے۔

غذائیات

ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ ہمدرد منزل لال کنواں دہلی۔ قیمت آٹھ آنہ۔

یہ رسالہ "ہمدرد" دہلی کی اشاعتِ خاص ہے۔ غذا سے متعلق مفید اور ضروری معلومات کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ ہے۔ تشریح کے لیے جا بجا دستی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

دلی کی دو سو برس کی تاریخ

تالیف مولوی سید حسن برنی صاحب۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

یہ اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ کا مقالہ ہے جس میں تیمور کے حملہ سے قبل کے دو سو برس کی دہلی کی تاریخ ہے۔ اس میں تاریخی واقعات نہیں بلکہ مسلمان بادشاہوں کی تعمیرات و آثارِ قدیمہ کا ذکر ہے۔

عمل

از محمد احمد صاحب ٹبلہ صدر بازار دہلی۔ مصنف سے مفت مل سکتی ہے۔

یہ حج کا سفرنامہ بھی ہے اور اس میں فریضۂ حج کی تمام ضروری معلومات بھی ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ نظامِ حج میں جو نقائص ہیں ان کو صاف صاف بیان کیا ہے کاش کہ ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

دہلی

از محمود علی خاں صاحب جامعی۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ضخامت ۶۴ صفحات قیمت ۴/

یہ کتاب آسان اور دلچسپ زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ گھر بیٹھے نئی اور پرانی دہلی کی سیر کر لیں۔ سمجھانے کے لیے بہت سی تصویریں اور نقشے بھی دیے ہیں۔

لطائفِ غالب

مرتبہ ایم۔ اے شاہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ پنجاب۔ لاہور۔

یہ مرزا غالب کے ۸۴ لطیفوں کا مجموعہ ہے جو ان کے خطوط یا اُن کی گفتگو سے لیے گئے ہیں۔

ملت اسلامیہ ہند اور جامعہ ملیہ دہلی

شائع کردہ حاجی محمد سعید ایسٹرن آپٹیکل کمپنی بہو بازار کلکتہ۔

یہ چھوٹا سا ٹریکٹ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جامعہ ملیہ کی تاسیس کا اصل مقصد کیا تھا اور کس طرح اس کے حصول میں جامعہ ناکام رہی ہے حتیٰ کہ آج اُس کی فضا اسلامی تعلیم و تربیت کے بجائے وردھا اسکیم کی نشو ونما کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

رسول کی باتیں (حصہ اول)

ناشر موتمر المصنفین بیت السعید کوچہ چیلان دہلی ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ۱۲/

اس میں احادیثِ نبوی کا سلیس ترجمہ کر کے انھیں مختلف عنوانات کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ حاشیئیں تمام تر مشکوٰۃ شریف سے لی گئی ہیں۔

My Life : A fragment

شائع کردہ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔

مولانا محمد علی مرحوم کو اپنی مضطرب زندگی میں کوئی باقاعدہ کتاب تصنیف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ ان کی پہلی اور آخری تصنیف ہے جسے انھوں نے جیل میں شروع کیا لیکن اسے بھی وہ مکمل نہ کر سکے۔ اس میں وہ اسلام کے متعلق اپنے ذاتی تصورات اور اسلام کی ایک عام فہم تشریح و تعبیر پیش کرنا چاہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے صرف پہلا حصہ ہے جس کے ساتھ دوسرے حصہ کے چند صفحات بھی ضمیمہ کے طور پر شامل ہیں۔ کتاب کے اس پہلے حصہ میں مولانا نے یہ دکھایا ہے کہ خانگی تربیت، تعلیمی ماحول، اور پھر اس کے بعد عام واقعاتِ زندگی سے ان کے اندر کس قسم کے مذہبی طرزِ فکر کی نشو ونما ہوئی ہے۔ علاوہ اُن واقعات کے جو براہ راست ان کے مذہبی تصورات پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ مولانا نے ضمنی طور پر اپنی زندگی کے دیگر حالات کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس طرح ذاتی عنصر کے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے کتاب ایک طرح کی خود نوشت سوانح عمری بن گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ کے جو صفحات ساتھ شامل ہیں اُن میں اُن غلط فہمیوں کا ذکر کیا ہے جو اسلام اور مغرب کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں۔ کتاب کے اکثر مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آگے چل کر

اسلام کے ہمہ گیر دینی نظریہ حکومت (Theocracy) کو پیش کرنا چاہتے تھے جس میں حاکمِ اعلیٰ اللہ تعالےٰ ہے اور انسان کی حیثیت اس کے نائب کی سی ہے۔ اسی لیے خود انھوں نے کتاب کا نام (Islam : The Kingdom of God) تجویز کیا تھا۔ افسوس کہ کتاب نامکمل رہ جانے کی وجہ سے موجودہ صورت میں اپنے مقصدِ تصنیف کو پورا نہیں کر سکتی۔

دل کی آواز اور آخری فیصلہ از قیسی رامپوری۔ کتابستان۔ قیمت عہ و عمہ۔

یہ دونوں ناول ہیں۔ مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "ان میں ایک ایسی روح اجاگر ہے جو شاید خبث کو شرافت سے چپکے چپکے بدلتی چلی جارہی ہے۔" پوری جستجو کے بعد بھی ہم ایسی روح کے وجود کو محسوس نہیں کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ "اگر آپ مجھے واعظ کی حیثیت سے دیکھیں گے تو آپ میرے ساتھ نہیں بلکہ اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کریں گے" ہم چونکہ ہر چیز کو اسی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور ہیں اس لیے کچھ مزید کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

ایشیا بکڈپو لاہور کی طرف سے چند نایاب اسلامی کتب کی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

تفسیر القرآن۔ آٹھ جلدوں میں (اردو) قرآن کی بہترین تفسیر۔ اصلی قیمت غیر مجلد عہ۔ رعایتی قیمت مجلد ۔ مجلد ۔ **جوہر قرآنی**۔ علامہ طنطاوی جوہری کی مشہور تصنیف کا اردو ترجمہ۔ اصلی قیمت عہ۔ رعایتی ۱۰ر۔ **انجیل برنباس**۔ اس مقدس اور اصلی انجیل کا اردو ترجمہ جسکو حاملانِ دینِ عیسوی نے عہد تاریک میں ناپید کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی تصریح موجود ہے۔ قیمت عہ۔ **فاتحۃ العلوم** تفسیر کبیر مصنفہ امام فخر الدین رازی کی جلد اول کا ترجمہ۔ سورہ الحمد کی مکمل تفسیر کا ترجمہ۔ کاغذ قدرے بوسیدہ۔ رعایتی قیمت عہ۔ **سیرۃ الرسول**۔ سیرۃ ابن ہشام کا اردو ترجمہ دو حصوں میں۔ مکمل سٹ کی رعایتی قیمت عہ۔ **تاریخ مراکش**۔ مراکش کے مشہور مورخ کی جامع تاریخ کا ترجمہ۔ اصلی قیمت ہے۔ رعایتی عہ ر۔ **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء**۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی مشہور تصنیف کا اردو ترجمہ تین حصوں میں۔ قیمت مکمل سٹ عہ ر۔ **مقدمہ ابن خلدون**۔ ابن خلدون کی مشہور تصنیف کا اردو ترجمہ۔ تین حصوں میں۔ قیمت عہ ر۔ **سفر دار المصطفےٰ**۔ ایک یورپین جاسوس کے سفرنامہ حجاز کا اردو ترجمہ۔ قیمت عہ ر۔

(نوٹ) محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا۔ تفسیر القرآن کے آرڈر کے ساتھ پیشگی دو روپے آنے چاہئیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوگی۔ تفسیر القرآن بوجہ کافی وزنی ہونے کے بذریعہ ریلوے پارسل جاسکتی ہے۔ اس لیے اپنے قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور تحریر کریں۔

… لاہور میں طبع ہوا

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں، اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	علاوہ
بے جلد ۱-۰-۰	بے جلد ۲-۰-۰	بے جلد ۱-۸-۰	محصول ڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)